



بَبُوقَءٌ تَحْفِظُ سُنَّتْ كَالْقِرْسُ
 (ذیبراہتمام، جمعیت علماء ہند)

قرأت خلف الامام

صحیح بخاری میں پیش کردہ دلائل کی روشنی میں

افادات

فخر الحاشين حضرت مولانا سيد فخر الدين احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

سابق صدر المدرسين دار العلوم دیوبند

تَرْكِيبُ

حضرت مولانا ریاست علی بجنوری
استاد حدیث دارالعلوم دیوبند

نکاشر

جمیعتہ علماء ہند بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی

قرأت خلف الامام

صحیح بخاری میں پیش کردہ دلائل کی روشنی میں

افادات

فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ
سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

ترتیب

حضرت مولانا ریاست علی بجنوری
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

ناشر

جمعیتہ علماء ہند۔ ۱، بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی۔ ۲

لكل جعلنا منكم شرعة و هم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے آئین اور طریق منہا جا۔ (سورۃ المائدہ، آیت ۴۸) عمل مقرر کیا ہے۔

مقاصد شریعت میں اتحاد کے باوجود کیفیت تفصیل میں یا ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اسباب کے اختیار کرنے میں جو اختلاف ہوتا ہے اس کو فروعی احکام میں اختلاف کہا جاتا ہے، چنانچہ نماز، روزہ، انفاق فی سبیل اللہ کے جو تفصیلی احکام ہیں، ان میں ام سابقہ اور امت محمدیہ کے درمیان فرق ہے، اور خود امت محمدیہ میں نصوص کی بنیاد پر جو فروعی احکام میں اختلافات ہیں ان کو رحمت فرمایا گیا ہے کہ اس سے توسع پیدا ہوتا ہے اور اختلاف کرنے والے تمام اہل ایمان کا مقصود، رضائے الہی کا حصول اور نجات آخرت ہی ہے۔ لیکن اگر اختلافات کی بنیاد دینی مفادات ہوں تو قرآن کریم میں اس کی مذمت بیان کی گئی ہے:

وما تفرقوا الا من بعد ما جاءهم اور نہیں تفرق ہوئے مگر علم آجانے کے بعد، بعض آپس العلم بغیا بینہم۔ (سورۃ الشوریٰ آیت ۱۴) کی ضد کی بنیاد پر۔

آیت پاک سے معلوم ہوا کہ علم حاصل ہونے کے بعد اختلاف نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو بغیا بینہم کے سبب ہوتا ہے اور آیت پاک میں جس چیز کو بغیا بینہم کہا گیا ہے اس سے مراد تعصب، نفسانیت، عداوت، حب جاہ، حب مال جیسی چیزیں ہیں جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں اور ان ناپسندیدہ امور کے پیش نظر حق کو تسلیم نہ کرنا اپنی مزمومہ رائے پر اصرار کرنا اور اختلاف پیدا کرنا ہرگز روا نہیں۔

جو لوگ حقیقت حال کے واضح ہونے کے باوجود فروعی اختلافات کو ہوادے کرامت کو انتشار میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں ان باتوں سے سبق لینا چاہیے اور ائمہ متبوعین اور اہل حق کے بارے میں زبان درازی اور دشنام طرازی سے بچنا چاہیے۔ کیونکہ فروعی اختلاف کا حکم یہ ہے کہ ہر مسلمان اور ہر جماعت کو اپنے ائمہ کے مسلک مختار کو رائج قرار دے کر اس پر عمل کرنا چاہیے اور دوسرے فریق کے بارے میں ہرزہ سرائی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

قرأت خلف الامام بھی اختلافی مسائل میں سے ہے، اور اس مسئلے میں اختلاف رائج اور مرجوح یا افضل وغیر افضل کا نہیں بلکہ واجب اور مکروہ تحریمی کا ہے لیکن اس کے باوجود

پیش لفظ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله محمد وعلى آله وصحبه اجمعين. اما بعد!

اسلام پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے اللہ کا نازل کیا ہوا وہ قدیم دین ہے جو حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام پر بھی نازل کیا گیا تھا اور ان سب پیغمبروں کو دین کے قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تھا اور ان کے ذریعے تمام اہل ایمان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ دین میں اختلاف پیدا نہ کریں۔ ارشاد باری ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَضَىٰ بِهِ تَحَارَىٰ لِيَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی نے وہی دین مقرر کیا ہے نُوْحًا وَالَّذِيْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَمَا وَضَّيْنَا بِهٖ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوسٰى وَعِيسٰى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ اِسْلَامٌ اَبْرٰهِيْمَ اور عیسیٰ کو دیا گیا تھا کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ اندازی نہ کرو۔ (سورۃ الشوریٰ آیت ۱۳)

چنانچہ اصول دین اور مقاصد شریعت میں تمام انبیاء اور ان کے آسمانی مذاہب میں اتحاد ہے، توحید، الوہیت، رسالت، بعث و نشر وغیرہ پر ایمان لانا ہمارے لیے بھی ضروری ہے اور امم سابقہ پر بھی ضروری تھا، اسی طرح صدق، امانت، عبادت، احسان، عدل اور سخاوت وغیرہ کا ان کو بھی حکم دیا گیا اور امت محمدیہ بھی ان احکام کی پابند ہے، لیکن مقاصد شریعت کے حصول کے طریقوں میں اختلاف ہو سکتا ہے، بلکہ ہوتا ہے کہ ہر امت کو اس کے زمانے اور اس کی استعداد کے مطابق تفصیل احکام کی ہدایت دی گئی۔ ارشاد خداوندی ہے:

کسی امام یا اس کے مقلدین نے دوسرے فریق کی نماز کو فاسد نہیں کہا، جبکہ اس زمانہ کا ایک نوزائیدہ فرقہ اس مسئلہ میں بھی حدود سے تجاوز کر رہا ہے۔

امام بخاریؒ قرأت خلف الامام کے قائل ہیں، انھوں نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ ”جزء القراءة خلف الامام“ کے نام سے تصنیف فرمایا ہے اور صحیح بخاری میں بھی ایک باب منعقد فرمایا ہے مگر یہ ترجمہ الباب صرف قرأت خلف الامام سے متعلق نہیں، بلکہ انھوں نے امام و منفرد کی قرأت کا مسئلہ بھی اسی کے ساتھ مربوط کر دیا، پھر اس کے ذیل میں جو تین روایات ذکر ہیں ان میں سے دو روایات کا مقتدی کی نماز سے کوئی تعلق نہیں، صرف ایک روایت اس مسئلہ سے متعلق ہے اور اس میں بھی مقتدی پر قرأت کے وجوب یا جواز کی تصریح نہیں، محض یہ ہے کہ اس کے عموم سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اور عموم سے فائدہ اٹھا کر کیا جانے والا استدلال نصوص فقہی کے اصول کے مطابق کمزور استدلال ہے، لیکن اس کمزوری کے باوجود امام بخاری کی جلالت شان کے پیش نظر بہت محتاط انداز اختیار کیا گیا ہے۔

فخر الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب قدس سرہ (سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند و سابق صدر جمعیۃ علماء ہند) کے درسی افادات پر مشتمل اس رسالہ میں اس مسئلہ پر امام بخاری کے پیش کردہ دلائل کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ امام بخاریؒ جس روایت کے عموم سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں وہ محل نظر ہے اور اس کے عموم میں مقتدی کو شامل سمجھنا قرآن، حدیث، تعامل صحابہ اور خود اس حدیث کے راویوں کے مسلک مختار کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام تحفظ سنت کانفرنس (منعقدہ ۲-۳ مئی ۲۰۰۱ء) کے موقع پر دارالعلوم دیوبند اس رسالہ کو شائع کر رہا ہے۔ دعا ہے کہ خداوند عالم ہم تمام مسلمانوں کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ان اختلافات سے ہماری حفاظت کرے جو خدا کے نزدیک بغیا بینہم کا مصداق ہیں۔

والحمد لله اولاً و آخراً

ریاست علی غفرلہ
استاذ دارالعلوم دیوبند

باب وجوب القراءة للامام والمأموم في الصلوات كلهما في الحضر والسفر وما يجهر فيها وما يخافت

امام اور مقتدی پر تمام نمازوں میں قرأت قرآن کے واجب ہونے کا بیان حضرت کی نماز ہو یا سفر کی اور وہ نماز ہو جس میں جہر کیا جاتا ہے یا وہ نماز جس میں سر اُپر اُچھا جاتا ہے

حدثنا موسى، قال: حدثنا ابو عوانة قال حدثنا عبد الملك بن عمير، عن جابر بن سمرة قال: شكى اهل الكوفة سعداً الى عمر فعمله واستعمل عليهم عمارة فشكوا حتى ذكروا انه لا يحسن يصل فارسل اليه فقال: يا ابا اسحاق ان هؤلاء يزعمون انك لا تحسن تصلي قال: اما انا والله فاني كنت اصلي بهم صلوة رسول الله ﷺ ما اخروم عنها، اصلي صلوة العشاء فازك في الاوليين واخف في الاخرين قال: ذلك الظن بك يا ابا اسحاق فارسل معه رجلاً او رجلاً الى الكوفة يسأل عنه اهل الكوفة ولم يدع مسجداً الا سأل عنه ويتنون عليه مغروفاً حتى دخل مسجداً لبني عبيس فقام رجل منهم يقال له: أسامة ابن قتادة يكنى ابا سعد فقال: اما اذ نشدتنا فان سعداً كان لا يسير بالسرية ولا يقسم بالسوية ولا يعدل في القضية قال سعد: اما والله لا دعون بئلا اللهم ان كان عبدك هذا كاذباً قام رياءً ومثعة فاطل عمرة واطل فقره وعرضه بالفتن وكان بعد اذا سئل يقول: شيخ كبير مفتون أصابني دعوة سعد قال عبد الملك: فاننا رأيت بعد قد سقط حاجباه على عينيه من الكبر وأنه ليتعرض للجوارى في الطرق يغمزهن.

حدثنا علي بن عبد الله قال: حدثنا سفيان، حدثنا الزهري عن

مَحْمُودُ بْنُ الرَّبِيعِ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ.

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَشَارٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ قَالَ: حَدَّثَنِي سَعِيدُ بْنُ أَبِي سَعِيدٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَدَخَلَ رَجُلٌ فَصَلَّى فَلَسَّمْ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ وَفَرَّدَ وَقَالَ: ارْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ فَرَجَعَ فَصَلَّى كَمَا صَلَّى ثُمَّ جَاءَ فَلَسَّمْ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: ارْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ ثَلَاثًا وَقَالَ: وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ مَا أَحْسَنُ غَيْرَهُ، فَعَلَّمَنِي فَقَالَ: إِذَا قُمْتَ إِلَى الصَّلَاةِ فَكَبِّرْ ثُمَّ اقْرَأْ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ ثُمَّ ارْكَعْ حَتَّى تَطْمَئِنَّ رَاكِعًا ثُمَّ ارْفَعْ حَتَّى تَغْتَدِلَ قَائِمًا ثُمَّ اسْجُدْ حَتَّى تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا ثُمَّ ارْفَعْ حَتَّى تَطْمَئِنَّ جَالِسًا وَافْعَلْ فِي صَلَاتِكَ كُلِّهَا.

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے کہ اہل کوفہ نے حضرت عمرؓ سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی شکایت کی تو حضرت عمرؓ نے انھیں معزول کر دیا اور حضرت عمار بن یاسر کو ان کا حاکم مقرر کر دیا، اہل کوفہ نے شکایت میں یہاں تک کہا کہ حضرت سعد نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھاتے، حضرت عمرؓ نے حضرت سعد کو بلایا اور کہا کہ اے ابواسحاق! یہ اہل کوفہ یہ کہتے ہیں کہ آپ نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھاتے؟ حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ میں خدا کی قسم، ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی نماز پڑھاتا رہا، اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ (مثلاً) عشاء کی نماز اس طرح پڑھاتا تھا کہ پہلی دو رکعتوں میں دیر تک ٹھہرتا تھا اور آخر دونوں رکعتوں میں تخفیف کرتا تھا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے ابواسحاق! آپ کے بارے میں گمان غالب یہی ہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے ان کے ساتھ ایک آدمی کو یا کئی آدمیوں کو کوفہ روانہ کیا جو اہل کوفہ سے حضرت سعدؓ کے بارے میں سوالات کر کے تحقیق کریں، انھوں نے کوفہ کی ایک ایک مسجد میں جا کر حضرت سعدؓ کے بارے میں تحقیق کی، اور اہل کوفہ حضرت سعدؓ کے اچھے کاموں کی تعریف کرتے رہے، یہاں تک کہ جب بنو عیسٰی کی مسجد میں گئے تو ایک شخص جن کو اسامہ بن قحادہ کہتے تھے اور جن کی کنیت ابوسعہ تھی۔ کھڑا ہوا اور کہا کہ جب آپ قسم دے کر پوچھتے ہیں تو بات یہ ہے کہ سعد جہاد کے لئے کھڑے ہوئے تھے، انھوں نے کہا کہ یہاں کی

تقسیم میں برابری نہیں کرتے اور فیصلہ میں انصاف نہیں کرتے۔ (یہ سن کر) حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ میں تو بخدا ضرور تین بددعاؤں کروں گا کہ اے اللہ! اگر تیرا یہ بندہ جھوٹا ہے اور ریا کاری اور شہرت کے لیے کھڑا ہوا ہے تو اس کی عمر کو روز فرما دے اور اس کے فقر کو طویل کر دے اور اس کو فتنوں کا نشانہ بنا دے۔ اور اس شخص سے جب بعد میں حال پوچھا جاتا وہ کہتا تھا کہ میں ایک عمر رسیدہ مبتلائے فتنہ بوڑھا ہوں مجھے سعد کی بددعا لگ گئی۔ عبدالملک نے کہا کہ میں نے اس کو بعد میں دیکھا، بڑھاپے کی وجہ سے اس کی دونوں پلکیں اس کی آنکھوں پر آگری تھیں اور راستے میں لڑکیوں کا پیچھا کرتا تھا یعنی اُن کو چھیڑتا تھا۔ حضرت عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی اُس کی نماز نہیں ہوئی، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو ایک شخص مسجد میں داخل ہوا پھر اس نے نماز پڑھی، پھر آ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا، آپ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ لوٹ کر جاؤ پھر نماز پڑھو اس لیے کہ تمہاری نماز نہیں ہوئی چنانچہ وہ شخص لوٹ کر گیا اور اس نے بیعتہم اسی طرح نماز پڑھی جیسے پہلے پڑھی تھی پھر آیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا پھر آپ نے یہی فرمایا کہ لوٹ کر جاؤ پھر نماز پڑھو اس لیے تمہاری نماز نہیں ہوئی، یہ بات تین مرتبہ پیش آئی، تو اس شخص نے عرض کیا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، میں اس سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا آپ مجھے سکھلا دیں! تو آپ نے فرمایا کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اللہ اکبر کہو، پھر جو قرآن کریم آسانی سے پڑھ سکتے ہو یعنی یاد ہے اس کی قرأت کرو پھر رکوع میں جاؤ۔ یہاں تک کہ رکوع کی حالت میں اطمینان ہو جائے پھر رکوع سے سر اٹھاؤ یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ پھر سجدہ میں جاؤ یہاں تک کہ سجدے کی حالت میں اطمینان ہو جائے پھر سجدے سے سر اٹھاؤ یہاں تک کہ بیٹھنے کی حالت میں اطمینان ہو جائے پھر اپنی پوری نماز میں اسی طرح عمل کرتے رہو۔

مقصد ترجمہ

فرماتے ہیں کہ تمام نمازوں میں قرأت ضروری ہے، ہر شخص کے لیے ضروری ہے

کہی ہے وہ کئی اجزاء سے مرکب ہے اور ان کا قدر مشترک یہ ہے کہ ہر طرح کی نماز میں ہر حال میں قرأت ضروری ہے اور اس کے لیے امام بخاری نے دلیل بھی مرکب پیش کی ہے، ہر روایت میں تمام اجزاء نہیں ہیں بلکہ مجموعہ روایات سے دعویٰ ثابت ہوگا۔ ہم اصل موضوع پر بعد میں کچھ گفتگو کریں گے، پہلے بخاری کی ذکر فرمودہ روایات کی تشریح اور ان سے بخاری کے مقصد کو ثابت کرنے کا طریقہ معلوم کر لیا جائے۔

تشریح حدیث اول

حضرت جابر بن سمرہ جو حضرت سعد بن ابی وقاص کے بھانجے ہیں بیان کرتے ہیں کہ کوفہ کے کچھ لوگوں نے حضرت عمرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص کی شکایتیں پہنچائیں اور حد ہوگئی یہاں تک کہ دیا کھج طرح نماز پڑھانا بھی نہیں جانتے۔

حضرت سعدؓ عشرہ مبشرہ میں ہیں اللہ کے راستے میں تیر اندازی کرنے والے پہلے مسلمان ہیں بدر اور دیگر غزوات میں شریک رہے ہیں، ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ دست میں شامل رہا کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر انھیں السّلمُ سدّد مسہمہ واجب دعوتہ کی دعادی تھی، اس لیے مستجاب الدعوات ہیں، حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں جب کوفہ کو منصوبے کے ساتھ آباد کیا گیا تو سعد بن ابی وقاص کو اس کا امیر مقرر کیا گیا اور کئی سال تک مسلسل وہاں کے امیر رہے اور کوفہ کی آبادی، نیز اس کی تعمیر و ترقی میں ان کا بڑا ہاتھ ہے کتنی عجیب بات ہے کہ حضرت سعدؓ کوفہ کی عظمت کو دوبالا کر رہے ہیں اور چند لوگ اسی زمانے میں متحدہ شکایتیں پہنچانے پر لگے ہوئے ہیں، بعض کا روایت میں تذکرہ آ رہا ہے۔

فعزّله عمر ان شکایات پہنچیں تو حضرت عمرؓ نے حضرت سعد کو معزول کر دیا، معلوم ہوا کہ اگر مصلحت کا تقاضہ ہو تو تحقیق حال، یا الزام ثابت ہونے سے پہلے معزول کرنا بھی جائز ہے، مصلحت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر یہ وہاں حاکم رہیں گے تو شکایات بڑھ سکتی ہیں، فتنہ پیدا ہو سکتا ہے وغیرہ، نیز یہ کہ شکایات کی تحقیق کا معتبر طریقہ بھی یہی ہے کہ حاکم کو تبدیل کر دیا جائے تاکہ بیان دینے والے بے خوف ہو کر زبان کھول سکیں، یہاں ایسا ہی ہوا کہ

ہر حال میں ضروری ہے امام کے لیے بھی اور مقتدی کے لیے بھی، سری نمازوں میں بھی اور جہری نمازوں میں بھی، سفر کی حالت میں بھی اور حضر کی حالت میں بھی نماز کے لیے قرأت ضروری ہے گویا یہ ترجمہ الباب ایک عام دعویٰ ہے، اور قرأت سے متعلق آنے والے ابواب اس کی تفصیل ہیں۔

بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بخاری مطلق قرأت کو ضروری کہہ رہے ہیں اور فاتحہ وغیرہ فاتحہ سے اس ترجمہ میں بحث نہیں کر رہے ہیں، گویا ہماری موافقت کر رہے ہیں جبکہ وہ اس مسئلے میں ہمارے ساتھ نہیں ہیں وہ تو قرأت خلف الامام کے علم بردار ہیں، اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ جزء القراءۃ خلف الامام کے نام سے تحریر فرمایا ہے اور اس میں امکان کی حد تک زور صرف کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہب ہے تو یہی ہے اور اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ یا تو ثابت نہیں یا بہت کمزور ہے۔ لیکن جب یہ مسئلہ صحیح بخاری میں آیا تو بڑی احتیاط سے کام لیا، امام بخاری کو اپنے مسلک کے مطابق کہنا چاہیے تھا وجوب الفاتحة للامام والماموم الخ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری بھی مسئلہ کی نزاکت کو سمجھ رہے ہیں کہ صاف کہنے کا موقع نہیں ہے، اس لیے ابہام سے کام لینا چاہیے ورنہ ان کے پیش نظر یہاں دو مسئلہ ہیں ایک قرأت خلف الامام کا مسئلہ اور دوسرے رکنیت فاتحہ کا، پہلے مسئلہ کے بارے میں تو انھوں نے فرمادیا القراءۃ للامام والماموم مقتدی کو امام کے ساتھ لے لیا کہ قرأت امام کے لیے بھی ضروری ہے اور مقتدی کے لیے بھی جبکہ یہ بات یہاں بھی واضح نہ ہو سکی کہ دونوں پر ایک ہی طرح کی قرأت ہے، فاتحہ بھی اور ضم سورت بھی یا ان دونوں میں کچھ فرق ہے کہ مقتدی پر صرف فاتحہ واجب ہو ضم سورت ضروری نہ ہو، اور دوسرے مسئلہ یعنی رکنیت فاتحہ کے سلسلے میں وہ بالکل خاموش گذر گئے، حالانکہ روایات باب میں وہ روایت بھی مذکور ہے جسے رکنیت فاتحہ کے سلسلے میں بڑے شدو مد سے پیش کیا جاتا ہے اور خود امام بخاری نے بھی جزء القراءۃ میں اس مسئلہ پر استدلال کرتے ہوئے پیش فرمایا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ امام بخاری یہاں جس چیز کی پردہ داری فرما رہے ہیں اس میں انصاف کے ساتھ غور کرنے والوں کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔ اصل مسئلہ کی وضاحت سے بچتے ہوئے امام بخاری نے ترجمہ الباب کے الفاظ میں جو بات

ہیں اور وہ تمام باتیں جنہیں شریعت میں ”معروف“ کہا جاتا ہے ان میں پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ جب نبو عیسیٰ کی مسجد میں پہنچے تو ایک شخص نے جس کی کنیت ابوسعہ اور نام اسامہ بن قنادہ تھا۔ یہ بیان دیا۔

اما اذا نسلقنا الخ مراد یہ ہے کہ دوسرے لوگوں نے جو تعریف کی باتیں کہی ہیں اس کے تو وہ ذمہ دار ہیں مگر آپ قسم دے کر پوچھ رہے ہیں تو کہنا پڑتا ہے کہ حضرت سعدؓ کے بارے میں پہلی بات یہ ہے کہ وہ جہاد کے لشکروں میں دوسروں کو روانہ کر دیتے ہیں اور خود شریک نہیں ہوتے، یہ کیا بات ہوئی؟ بزدلی کا اہرام اور شجاعت کی نفی ہوئی، اور دوسری بات یہ کہ مال کی تقسیم انصاف کے ساتھ نہیں کرتے، جنبہ داری کرتے ہیں، یہ دیانت پر اعتراض ہوا کہ اپنوں کو دیتے ہیں یا خود زائد رکھ لیتے ہیں اور تیسری بات یہ کہ فیصلہ انصاف کے ساتھ نہیں کرتے اور رعایت سے کام لیتے ہیں، یہ عدالت پر حملہ ہوا، خلاصہ یہ ہوا کہ اس شخص نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ پر تین طرح کے الزامات عائد کئے ایک کا تعلق شجاعت کی نفی سے تھا جو قوت غضب کے کمال و اعتدال کا نام ہے، دوسرے کا تعلق دیانت و عفت کی نفی سے تھا جو قوت شہوانیہ کے کمال و اعتدال کا نام ہے اور تیسرے کا تعلق حکمت و عدل کی نفی سے تھا جو قوت عاقلہ کے کمال و اعتدال کا نام ہے، گویا اس شخص نے حضرت سعد کے تینوں اخلاقی فضائل و کمالات کا سرے سے انکار کر دیا۔ جب کہ وہ ان تمام عیوب سے بری تھے اور تمام ان کمالات کے حامل تھے جن کی مذکورہ شخص نے نفی کی، یہ سن کر حضرت سعدؓ کو غصہ آ گیا اور آنا بھی چاہیے تھا کہ وہ اتنی بے سرو پا باتیں کہہ گیا، بعض روایات میں ہے فغضب سعد، اور بعض میں ہے اعلیٰ تشجع؟ افسوس ہے کہ تم میرے بارے میں اتنی دیدہ دلیری کر رہے ہو؟

اما والله لادعون الخ حضرت سعدؓ کو غصہ آیا اور انھوں نے الزام عائد کرنے والے کو تین بد دعائیں دیں، لیکن کتنی حیرت اور کتنے انصاف کی بات ہے کہ غصہ کی حالت میں پوری احتیاط ملحوظ ہے، بد دعا کو دو باتوں پر معلق کر رہے ہیں کہ پروردگار اگر یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے اور اگر اس کے پیش نظر دنیوی اغراض ہیں تو میں اس کے عائد کردہ تین الزامات کے بقدر تیزی بارگاہ میں تین باتیں عرض کرتا ہوں، یہ کہتا ہے کہ میں لشکر میں نہیں

حضرت عمرؓ نے، حضرت سعدؓ کو الگ کر دیا، پہلے تو حضرت سعدؓ کو بلایا اور ان سے معلوم کیا کہ آپ کے بارے میں یہ شکایت آئی ہے کہ آپ نماز ٹھیک طریقے پر نہیں پڑھاتے۔ حضرت سعدؓ نے اس کے جواب میں جو بیان دیا۔ اور اسی سے امام بخاری کا ترجمہ الباب بھی متعلق ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ میں نماز کے اندر پورے طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی پیروی کرتا ہوں، اس میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں کرتا، مثال کے طور پر بتاتا ہوں کہ عشاء کی نماز چار رکعت ہے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق پہلی دو رکعتوں میں دیر تک ٹھہرتا ہوں اور آخر کی دو رکعتوں کو ہلکا رکھتا ہوں، مطلب یہ ہے کہ پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ ضم سورت بھی ہے اور آخری دو رکعتوں میں ضم سورت نہیں ہے۔

اس سے ترجمہ الباب کا ایک جز، یعنی قرأت علی الامام ثابت ہو گیا، مقتدی پر قرأت کے وجوب یا جواز کے لیے روایت میں کوئی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ اور ثابت ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر رکعت میں قرأت فرماتے تھے اور یہ کہ بعض نمازوں میں جبر تھا اور بعض میں سر تھا لیکن یہ کہ ایسا کرنا واجب یا سنت ہے تو اس کے لیے بھی روایت میں کوئی صراحت نہیں ہے ہاں اتنا کہا جاسکتا ہے کہ آپ کا یہ عمل مواظبت کے ساتھ تھا اس لیے اس سے وجوب کی طرف اشارہ ہو گیا۔

ذاک الظن بک حضرت عمرؓ نے فرمایا، آپ کے بارے میں ہمارا گمان بھی یہی ہے، یعنی ہمیں اطمینان ہے، حضرت عمرؓ نے بعد میں ایک موقع پر اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا ہے فانی لم اعزله من عجز و لاختیانه کہ میں نے حضرت سعدؓ کو کسی کوتاہی میں یا خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا آپس کی اور نجی معاملات کی بات تو یہ ہوئی لیکن شکایات کے ازالہ کے لیے باقاعدہ تحقیق بھی ضروری ہے۔

فارسل معہ الخ چنانچہ تحقیق احوال کے لیے چند آدمیوں کو حضرت سعدؓ کے ساتھ کوہ روانہ فرمایا، ان لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کوفہ کی تمام مسجدوں میں پہنچے کہ ہاں تمام مسلمانوں کا اجتماع ہوتا ہے اور حضرت سعدؓ کی تمام شکایات کے بارے میں دریافت کیا کہ آپ لوگوں نے ان کو کیسا پایا؟ ہر جگہ حضرت سعدؓ کی تعریف ہی سنی کہ آپ بڑے اچھے

رکعت فاتحہ اور دوسرے قرأت خلف الامام، اس روایت سے پہلے مسئلہ پر استدلال کا طریقہ یہ ہے کہ یہاں لاصلوۃ الخ فرمایا گیا ہے، لائے نفی جنس حقیقت کے انقضاء کا تقاضہ کرتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورۃ فاتحہ کے بغیر حقیقت صلوۃ ہی تحقق نہ ہوگی اور رکعت کے یہی معنی ہیں۔

دوسرے مسئلہ پر استدلال کا طریقہ یہ ہے کہ روایت میں دو جگہ عموم ہے ایک لاصلوۃ میں، کہ نکرہ، نفی کے تحت عموم کا فائدہ دیتا ہے گویا مطلب یہ ہوا کہ نماز امام اور منفرد کی ہو یا مقتدی کی، نیز جہری ہو کہ سبزی، سفر کی ہو یا حضر کی قرأت فاتحہ کے بغیر اس کا وجود ہی نہیں، اور دوسرا عموم لمن لم یقرء کے کلمہ من میں کہ نماز کوئی بھی ہو، امام ہو یا مقتدی، فاتحہ کی قرأت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

دوسرے مسئلہ پر تو گفتگو تینوں روایات کی تشریح کے بعد کی جائے گی، البتہ پہلے مسئلہ یعنی رکعت فاتحہ کے سلسلے میں یہیں یہ بات عرض کر دی جائے کہ امام شافعی رکعت کے قائل ہیں، امام مالک کی ایک روایت بھی اسی کے مطابق ہے، دوسری روایت میں وہ فاتحہ اور ضم سورت دونوں کی رکعت کے قائل ہیں، امام احمد مشہور قول میں شوافع کے ساتھ ہیں اور دوسرا قول حنفیہ کے مطابق ہے۔

رکعت فاتحہ کے سلسلے میں ائمہ علیہ کی دلیل یہی حضرت عبادہ کی روایت ہے جس میں لاصلوۃ لمن الخ فرمایا گیا ہے، استدلال کا طریقہ ذکر کیا جا چکا ہے، حنفیہ کی دلیل قرآن کریم کی آیت ہاقراء و اماتیسر من القرآن ہے جس سے مطلق قرأت کی رکعت ثابت ہوتی ہے، نیز مسی فی الصلوۃ کی صحیح روایت جو اسی باب میں مذکور ہے، جس میں ہم اقرا اماتیسر معک من القرآن فرمایا گیا ہے اس سے بھی مطلق قرأت کی رکعت کا ثبوت ہو رہا ہے، گویا قرآن کریم کی آیت جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالة ہے۔ مطلق قرأت کو فرض قرار دے رہی ہے اور حضرات شوافع حضرت عبادہ کی روایت لاصلوۃ الخ سے جو خبر واحدہ ہے اور ظنی الثبوت و ظنی الدلالة ہے۔ قرآن کریم کے عموم کی تخصیص کر رہے ہیں اور ایسا کرنا حضرات حنفیہ کے مقرر کردہ اصول کے خلاف ہے۔

بعض حضرات کی طرف سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ حدیث لاصلوۃ الخ خبر واحد نہیں خبر مشہور ہے جیسا کہ امام بخاری نے جزء القراءة میں ارشاد فرمایا ہے اور خبر مشہور سے کتاب

جاتا، مجھے جان پیاری ہے اور میں طویل زندگی کا خواہش مند ہوں، میں اس کے بارے میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اس کی عمر کو دراز کر دے، یعنی اس کو قوی کی کمزوری کے ساتھ ارذل العریک پہنچا دے، یہ شخص الزام عائد کرتا ہے کہ میں مال کی تقسیم میں برابر ہی نہیں کرتا اور گویا میں مال کا طلب گار ہوں الہی اگر یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے تو اس کے فقر کو طویل کر دے، یہ شخص مجھ پر یہ عیب لگاتا ہے کہ میں انصاف سے کام نہیں لیتا جنبہ داری کرتا ہوں گویا میں مسلمانوں کے نزاعی معاملات میں تصفیہ کرنے کے بجائے فتنے پیدا کرتا ہوں الہی اگر یہ جھوٹ بول رہا ہے تو اس کو فتنوں میں مبتلا کر دے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص مستجاب الدعوات تھے، تینوں بد دعائیں قبول ہو گئیں، اس شخص کی عمر بھی طویل ہوئی، فقر اور فتنہ میں بھی مبتلا ہوا، ناپسندیدہ بھی ہو گیا تھا اور مانگتا پھرتا تھا۔ اس سے کوئی پوچھتا کہ کیا حال ہے؟ تو کہتا تھا کہ حضرت سعد کی بد دعا کھا گئی؟ بوزھا ہوں، عمر رسیدہ ہوں، مبتلائے فتنہ ہوں وغیرہ۔ عبدالملک کہتے ہیں کہ میں نے اس شخص (ابوسعبدہ) کو اس حال میں دیکھا کہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی آنکھ کی ابرو نیچے ٹنک گئی تھی اور راستے میں چلتے ہوئے عورتوں کو چھیڑتا تھا۔

پہلی روایت ختم ہو گئی، اس سے صرف یہ معلوم ہوا کہ امام قرأت کرے گا۔ مقتدی یا منفرد کا اس میں کوئی ذکر نہیں، البتہ روایت سے متعدد فوائد مستنبط ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ ظالم کے لیے بد دعا کرنا جائز ہے، اور یہ کہ اہل اللہ سے دل میں کدورت رکھنا تاہی کا سبب ہوتا ہے، اور شاید حضرت سعد نے بد عائدے کہ اس ظالم کو آخرت کے عذاب سے بچایا ہے کہ اس کے ان ابرے اعمال کی دنیا ہی میں سزا مل جائے اور وہ آخرت کی گرفت سے بچ جائے۔ واللہ اعلم

تشریح حدیث دوم

دوسری روایت حضرت عبادہ بن صامت کی ہے جسے رکعت فاتحہ اور قرأت خلف الامام کے ثبوت کے لیے بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، روایت میں ہے کہ جس نے فاتحہ الکتاب کو نہیں پڑھا تو اس کی نماز ہی نہیں ہوئی۔ مقصد ترجمہ کی وضاحت میں بیان کیا گیا تھا کہ امام بخاری کے پیش نظر دو مسئلے ہیں، ایک

مشہور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے اور بعض روایات میں ہے کہ آپ مسجد کے ایک گوشہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک صاحب جن کا نام عطاء بن رافع انصاری تھا، مسجد میں آئے، پہلے انھوں نے دو رکعت نماز ادا کی، ہو سکا ہے کہ یہ نماز تحیۃ المسجد کی ہو یا اور کوئی نفل نماز ہو اور ممکن ہے کہ مسجد میں نماز ہو چکی ہو اور انھوں نے اپنی نماز ادا کی ہو، بہر حال انھوں نے انفرادی نماز پڑھی بعض روایات میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھتے رہے یہ مصنفہ کے الفاظ ہیں، نماز کے بعد وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کر کے جانا چاہتے تھے کہ آپ نے سلام کے جواب کے ساتھ یہ فرمادیا کہ ارجع فصل الخ تمھاری نماز نہیں ہوئی دوبارہ نماز پڑھو، انھوں نے دوبارہ اسی طرح نماز پڑھی، آپ نے پھر لوٹا دیا، اسی طرح جب تین مرتبہ لوٹا دیا تو انھوں نے کہا والسیدی بسعشک الخ یعنی میں قسم کھا کر عرض کرتا ہوں کہ میں اپنی دانست میں نماز کو اچھی طرح پڑھ رہا ہوں، میں اس سے بہتر نہیں جانتا، آپ تعلیم فرمائیں کہ کیا کوتاہی ہو رہی ہے؟ اس تفصیل سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جو کوتاہی ہو رہی تھی وہ ایسی نہیں تھی جس سے نماز باطل ہو جائے، کیونکہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک شخص پیغمبر علیہ السلام کے لوٹانے پر بار بار باطل عمل کرتا رہے اور آپ خاموشی اختیار کئے رہیں، اس کے عمل میں کچھ تو قابل قبول ہونے کی شان ہونی چاہیے، مثلاً یہ کہ وہ اصل ارکان و فرائض تو ادا کر رہا تھا اور واجبات میں کوتاہی ہو رہی تھی، بہر حال اس نے درخواست کی تو آپ نے فرمایا اذا قمت الى الصلوة الخ کہ جب تم نماز کا ارادہ کرو تو تکبیر تحریرہ کو ہم اقرا ماتیسرا الخ پھر قرآن کریم کا جو حصہ تمھارے لیے آسان ہو یعنی جو بھی یاد ہو، حدیث میں بیہودہ حکم دیا گیا ہے جو قرآن کریم میں ہے یعنی ثم اقرا ام القرآن الخ بالفتح وغیرہ نہیں فرمایا گیا بلکہ مطلق قرأت کا حکم دیا گیا ہے اب اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ مائیسر سے مراد سورہ فاتحہ ہی ہے تو یہی کہا جائے گا کہ یہ تشریح تو آپ خود کر رہے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مائیسر ہی فرمایا ہے۔

اس کے بعد آپ نے رکوع و سجود اور ان میں تعدیل ارکان کی اہمیت کو بیان فرمایا کہ اسی کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے نماز کا اعادہ کرایا جا رہا تھا پھر آپ نے فرمایا و افعل فی صلوتک کلھا کہ اپنی پوری نماز میں مذکور ہدایات کی پیروی کرتے رہو۔ صلوتک سے

اللہ کی تخصیص جائز ہے، لیکن علامہ یعنی نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس روایت کو خبر مشہور قرار دینا جائز نہیں ہے خبر مشہور وہ ہے جسے عہد تابعین میں متقی بالقبول کا درجہ حاصل ہو گیا ہو اور یہاں ایسا نہیں ہے کیونکہ یہ مسئلہ عہد تابعین میں اختلافی رہا ہے، اور اگر بالفرض اس کو خبر مشہور تسلیم کر بھی لیا جائے تو دوسری بات یہ ہے کہ کتاب اللہ کی تخصیص کے لیے خبر مشہور کا محکم ہونا ضروری ہے۔ محتمل سے کام نہیں چلتا اور یہاں یہ قوی احتمال موجود ہے کہ لاصلوۃ میں نفی کو حقیقت کے بجائے کمال کی نفی پر محمول کیا جائے۔

(یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ حضرت عبادہ کی روایت میں لاصلوۃ کو نفی کمال پر محمول کرنے کی بات حنفیہ کے یہاں صرف اس صورت میں ہے جب تمام قرآن سے صرف نظر کر کے صرف انہی الفاظ کے ظاہر پر انحصار کیا جائے جو بخاری کی روایت میں ہیں اور مراد یہ ہو کہ فاتحہ نہ پڑھنے کی صورت میں نماز کی نفی کی جارہی ہے لیکن اگر دیگر قرآن کا لحاظ کر کے معنی کا تعین کیا جائے اور مراد یہ متعین کی جائے کہ فاتحہ اور سورت دونوں کے نہ پڑھنے کی صورت میں نماز کی نفی کی جارہی ہے تو اس صورت میں لاصلوۃ سے نفی ذات کو مراد لیا جائے گا۔) اس احتمال کے قوی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی صحیح روایت نے نفی کمال کے معنی ہی کو راجع کر دیا ہے، جس میں ارشاد فرمایا گیا من صلی صلوۃ لم یقرء فیہا بام القرآن فہی خداج فلما غیر تمام (مسلم جلد ۱، ص ۱۶۹) جس نے نماز میں سورہ فاتحہ کو نہیں پڑھا اس کی نماز ناقص و ناتمام ہے۔

اس لیے حنفیہ نے تو قرآن و حدیث دونوں پر عمل کرتے ہوئے مطلق قرأت کو رکوع اور فرض، اور سورہ فاتحہ کی قرأت کو واجب قرار دیا ہے کہ مطلق قرأت نہ کرے تو سرے سے نماز ہی نہیں ہوئی اور اگر قرأت کرے لیکن سورہ فاتحہ کو نہ پڑھے تو نماز ناتمام ہوئی، اور ترک واجب کی بنیاد پر نماز واجب الاعادہ قرار پائی، گویا پڑھی بے پڑھی برابر ہو گئی، اس لیے بعض حضرات نے اس کو تقریباً نزاع لفظی قرار دیا، لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ حنفیہ کی نظر دقیق ہے اور وہ تمام دلائل کو اپنی جگہ رکھنے میں زیادہ کامیاب ہیں۔

تشریح حدیث سوم

تیسری روایت حضرت ابو ہریرہؓ کی ہے جو سنی فی الصلوۃ کی روایت کے نام سے

یہاں یہ ظاہر وہی نماز مراد ہوگی جو مخاطب کی طرف منسوب ہے، اور ظاہر ہے کہ وہ نماز انفرادی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ مفرد کے لیے نماز میں قرأت ضروری ہے۔

امام بخاری کے استدلال کا خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ امام بخاری کا ترجمۃ الباب نماز میں قرأت کے وجوب سے متعلق کئی اجزاء پر مشتمل تھا اور ان اجزاء کو ثابت کرنے کے لیے امام بخاری نے جو تین روایات پیش کی ہیں ان میں پہلی روایت کا تعلق صرف امام سے ہے اور تیسری کا صرف مفرد سے، البتہ حضرت عبادہ بن صامت کی دوسری روایت میں گو کہ امام، مفرد اور مقتدی میں سے کسی کی صراحت نہیں، لیکن اس کی تعبیر کے عموم میں یہ ظاہر مقتدی کو بھی داخل مانا جاسکتا ہے، اس لیے قرأت خلف الامام کے مسئلہ پر جو بخاری کے ترجمۃ الباب کے کئی اجزاء میں سب سے اہم جز ہے صرف دوسری روایت سے استدلال ممکن ہے اس لیے اس روایت سے قرأت خلف الامام کے مسئلہ پر کئے گئے استدلال کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ مقتدی اس کے عموم میں داخل ہے یا نہیں؟ لیکن اس مسئلہ کو شروع کرنے سے پہلے فقہاء کے مذاہب کا بیان کر دینا مناسب ہے۔

بیان مذاہب ائمہ

حنفیہ کا مذہب ہے کہ نماز جہری ہو یا سری، امام کے پیچھے مقتدی کا قرأت کرنا جائز نہیں، البتہ بعض کتابوں میں امام محمدؒ کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے کہ وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کو احتیاط کے طور پر مستحسن کہتے ہیں لیکن امام محمدؒ کی موطا اور کتاب الآثار میں اس کے خلاف ہے اس لیے ابن ہمام نے لکھا ہے الاصح ان قول محمد کقولہما امام مالک اور احمد کے نزدیک جہری نمازوں میں مقتدی کو قرأت کی اجازت نہیں اور مفتی ابن قدامہ میں هذا احد قولی الشافعی کہ امام شافعی کے دو اقوال میں سے ایک قول مالکیہ اور حنبلیہ کے موافق ہے، نیز مالکیہ اور حنبلیہ کے یہاں سری نمازوں میں گو مقتدی کو سورۃ فاتحہ پڑھنے کی اجازت ہے مگر پڑھنا واجب کسی کے نزدیک نہیں ہے بلکہ مالکیہ کی کتابوں میں اس طرح

کی صراحت ہے فان ترک القراءة فلا شئی علیہ لان الامام یحملہا کہ اگر سری نماز میں مقتدی نے قرأت نہیں کی تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ امام اس ذمہ داری کو پورا کر رہا ہے، البتہ امام احمد کے یہاں جہری نمازوں میں بھی اگر مقتدی دوری کی وجہ سے امام کی قرأت کو سن نہ پا رہا ہو تو قرأت کی اجازت ہے، واجب یہاں بھی نہیں ہے، گویا یہ تینوں امام مقتدی کے باب میں ایک ہی انداز اختیار کئے ہوئے ہیں۔

البتہ امام شافعیؒ کی طرف مشہور قول کے مطابق یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ نماز جہری ہو یا سری مقتدی پر قرأت واجب ہے ”مختصر حرنی“ اور ”مہذب“ میں وجوب ہی کی بات نقل کی گئی ہے امام بیہقی وغیرہ نے اسی کو امام شافعی کا قول جدید قرار دیا ہے، لیکن امام شافعیؒ کی کتاب الام سے اس کی تائید نہیں ہوتی، کتاب الام کے کتب قدیمہ یا جدیدہ میں ہونے کے سلسلے میں شوافع میں دونوں طرح کی باتیں ملتی ہیں۔ امام الحرمین نے اس کو امام شافعیؒ کی کتب قدیمہ میں شمار کیا ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ کتاب الام، امام شافعیؒ کے مصر منتقل ہونے کے بعد کی تصنیف ہے، اور مصر جانے کے بعد کی کتابیں کتب جدیدہ کہلاتی ہیں، اسی لیے جلال الدین سیوطی نے اس کو کتب جدیدہ میں شمار کیا ہے۔

کتاب الام میں ایک جگہ امام شافعیؒ نے امام اور مفرد کے بارے میں یہ حکم بیان فرمایا کہ ان پر ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، پھر اس کے بعد فرمایا و ساذکر العاموم ان شاء اللہ تعالیٰ کہ مقتدی کا حکم بعد میں بیان کیا جائے گا (کتاب الام جلد ۱ ص ۹۳) پھر اختلاف عنی و عبد اللہ بن مسعود کے تفصیلی ابواب میں کتاب الام (جلد ۷ ص ۱۵۳) میں مقتدی کے بارے میں یہ تحریر فرمایا کل صلوۃ صلیت خلف الامام و الامام یقرء قرأۃ لا یسمع فیہا قسراً فیہا، ہر وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے اور امام ایسی قرأت کر رہا ہو جو سن نہ جاتی ہو تو مقتدی اس نماز میں قرأت کرے گا (کتاب الام جلد ۷ ص ۱۵۳) اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ امام جہری نماز میں ہو اور مقتدی قرأت سن رہا ہو تو اس کو قرأت نہیں کرنی چاہیے، لیکن کتاب الام کی ان تصریحات کے باوجود شوافع کا مسلک مختار یہی ہے کہ مقتدی پر بھی تمام رکعات میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے، شرح مہذب میں ہے ان مذہبنا وجوب قراءة الفاتحة على العاموم في كل الركعات من

مذہب کا خلاصہ انصاف کی رو سے یہ ہوا کہ حضرات ائمہ اقتداء کے مسئلہ کو الگ اور امامت و انفراد کے مسئلہ کو الگ دیکھ رہے ہیں، گویا شریعت کی نظر میں یہ دو مستقل باب ہیں جنہیں الگ الگ قائم کیا گیا ہے، کیونکہ امام اعظم، امام مالک اور امام احمد کے یہاں تو جہری نماز میں مقتدی پر قرأت نہیں ہے اور امام شافعی نے بھی کتاب الامام میں یہی فرمایا ہے کہ وہ اقتداء کے مسئلہ کو الگ بیان کریں گے، پھر یہ کہ مندرجہ بالا معروضات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ امام شافعی اور ان کے تلامذہ کے عہد میں قرأت خلف الامام کے وجوب کی بات محقق نہیں تھی۔

اس سلسلے میں ائمہ متبوعین کے مذاہب کی تفصیل تو وہ ہے جو عرض کی گئی، لیکن یہاں پر امام ترمذی نے کمال کر دیا کہ قرأت خلف الامام کے سلسلے میں امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کو ایک طرف دکھلایا اور اہل کوفہ کو دوسری طرف، گویا تکثیر سواد مطلوب ہے، حالانکہ اس کا موقع نہیں تھا کیونکہ امام مالک اور امام احمد جہری نماز میں تو ترک قرأت کے قائل ہیں اور سری میں بھی قرأت کو واجب نہیں کہتے۔ واللہ اعلم

صحابہ تابعین اور دیگر اہل علم کا مسلک

یہ تو تھا ائمہ متبوعین کے مذہب کا بیان، ان کے علاوہ صحابہ تابعین اور دیگر اہل علم اور فقہاء اسلاف کا کیا مسلک ہے تو اس سلسلے میں امام احمد کا قول نقل کیا جا چکا ہے جس کا حاصل یہ تھا کہ امام احمد کے علم میں مقتدی پر وجوب قرأت کا اہل اسلام میں کوئی بھی قائل نہیں، اور اس قول کے بعد یہ تفصیل بھی مذکور ہے:

قال (احمد) هذا النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ والتابعون وهذا مالک فی اہل الحجاز وهذا الثوری فی اہل العراق وهذا الاوزاعی فی اہل الشام وهذا الليث فی اہل مصر ما قالوا الرجل صلی خلف الامام وقرأ امامہ ولم یقرأ هو، صلوتہ باطلۃ۔ (المنی جلد ۲ ص ۲۶۲)

امام احمد نے فرمایا کہ یہ ہیں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم، اور یہ ہیں آپ کے صحابہ اور صحابہ کے تابعین اور یہ ہیں اہل حجاز میں امام مالک، اور یہ ہیں اہل عراق میں ثوری،

الصلوة السرية والجهرية، هذا هو الصحيح عندنا بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ وفات سے دو سال پہلے تک امام شافعی جہری نمازوں میں قرأت کی اجازت نہ دیتے تھے، بعد میں قرأت خلف الامام کے قائل ہو گئے گویا امام شافعی کی رائے بدل گئی، لیکن امام شافعی کے تلامذہ میں اتفاق رائے نہیں ہے اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے زمانے میں وجوب کی بات محقق نہ ہو اور نیچے آ کر تشدد اختیار کر لیا گیا ہو، دیکھئے امام احمد سے منقول ہے۔ ما سمعنا احدا من اهل الاسلام يقول: ان الامام اذا جهر بالقراءة لا تجزى صلوة من خلفه اذا لم يقرأ (المنی جلد ۲ ص ۲۶۲) ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو بھی اس بات کا قائل نہیں پایا کہ جہری نماز میں مقتدی قرأت نہ کرے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ امام احمد کی اس بات سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان کی نظر میں امام شافعی کا قول وجوب کا نہیں ہے ورنہ وہ اتنا عام دعویٰ نہ کرتے۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس ہے کہ امام شافعی اور ان کے تلامذہ کے دور میں شاید یہ محقق نہیں تھا کہ جہری نماز میں قرأت خلف الامام کو واجب قرار دیا جائے یا مستحب، مگر بعد میں وجوب کے قول کو ترجیح دے دی گئی۔

علامہ ابن تیمیہ نے بھی فتاویٰ میں امام احمد کی طرف سے جہری نماز میں قرأت کے عدم وجوب پر اجماع نقل کیا ہے، ذمہ داری اُن پر ہے الفاظ یہ ہیں و ذکر (الامام احمد) الاجماع علی انه لا تجب القراءة علی المأموم حال الجهر (فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۲ ص ۲۶۹) نیز دوسری جگہ اپنے طور پر مسازاد علی الفاتحة کے سلسلے میں عدم وجوب پر اجماع، اور فاتحہ کے سلسلے میں عدم وجوب کو جمہور سلف کا قول قرار دیا ہے۔ اور امام کے جہر کرنے کی حالت میں قرأت کو منکر اور کتاب و سنت کے خلاف کہا ہے، کہتے ہیں والاممر باستماع قراءة الامام والانصات له مذکور فی القرآن وفي السنة الصحيحة وهو اجماع الامة فيما زاد علی الفاتحة وهو قول جماهير السلف من الصحابة وغيرهم فی الفاتحة وغيرها وهو احد قولی الشافعی واختاره طائفة من حذاق اصحابه كالرازي وابی محمد بن عبد السلام فان القراءة مع جهر الامام منكر مخالف للكتاب والسنة.

اور یہ ہیں اہل شام میں امام اوزاعی، اور یہ ہیں اہل مصر میں امام لیث، ان میں سے کوئی بھی مقتدی کے بارے میں۔ جب امام قرأت کرے اور مقتدی قرأت نہ کرے۔ یہ نہیں کہتا کہ اس کی نماز باطل ہے۔

امام احمد کا یہ ارشاد صاف بتا رہا ہے کہ انھوں نے جو ایک عام دعویٰ کیا تھا کہ اہل اسلام میں کوئی بھی مقتدی پر وجوب قرأت کا قائل نہیں، وہ کوئی سرسری بات نہیں ہے بلکہ انھوں نے یہ بات رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، صحابہ و تابعین کے اقوال و تعامل اور مشہور بلاد اسلامیہ کے فقہاء کرام کے مسلک مختار کی تحقیق کے بعد ارشاد فرمائی ہے۔

پھر صاحب مغنی موفق الدین ابن قدامہ کے شاگرد اور پیچھے شمس الدین ابن قدامہ نے شرح مقنع میں بعض صحابہ، تابعین اور فقہاء کے نام بھی اس طرح ذکر کئے ہیں، فرماتے ہیں۔

ولا تجب القراءة على المأموم هذا قول اكثر اهل العلم ومن كان لا يرى القراءة خلف الامام على وابن عباس وابن مسعود وابو سعيد وزيد بن ثابت وعقبة بن عامر وجابر وابن عمر وحذيفة بن اليمان وبه يقول الثوري وابن عيينة واصحاب الراي ومالك والزهري والاسود وابراهيم وسعيد بن جبیر قال ابن سيرين لا اعلم من السنة القراءة خلف الامام.

(شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۱)

اور مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے، اکثر اہل علم کا قول یہی ہے، اور جو اہل علم قرأت خلف الامام کے قائل نہیں تھے ان میں حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت ابوسعید، حضرت زید بن ثابت، حضرت عقبہ بن عامر، حضرت جابر، حضرت ابن عمر، حضرت حذیفہ بن الیمان ہیں، اور اسی کے قائل سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، اصحاب رائے اور امام مالک، امام زہری، اسود، ابراہیم اور سعید بن جبیر ہیں، اور ابن سیرین نے فرمایا کہ قرأت خلف الامام کے سنت ہونے کو تنہا نہیں جانتا۔

”ممن كان لا يرى“ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ واجب نہ کہنے والوں کی پوری فہرست نہیں ہے بلکہ ان میں سے چند اہم نام ذکر کر دیے گئے ہیں، نیز یہ کہ جس طرح امام احمدؒ نے فرمایا تھا کہ قرأت خلف الامام کے وجوب کا عالم اسلام میں کوئی قائل نہیں۔ اسی طرح

محمد بن سیرین کے الفاظ سے واضح ہے کہ قرأت خلف الامام کا عمل خلاف سنت ہے۔

حضرت عبادہؓ کی روایت کے عموم سے استدلال

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جمہور صحابہ و تابعین کا مسلک قرأت خلف الامام کا وجوب یا استحسان نہیں ہے اور حدیث پاک کے پورے ذخیرے میں ایک صحیح روایت بھی ایسی نہیں جس میں قرأت خلف الامام کے وجوب کی صراحت ہو، البتہ بعض روایات کے اجمال اور عموم سے اس مسلک پر استدلال کیا گیا ہے، جن میں سب سے مضبوط روایت حضرت عبادہ بن صامت کی ہے۔ لاصلوة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب اس میں دو جگہ عموم ہے ایک نکرہ نفی کے تحت ہے، جو ہر طرح کی نماز کو شامل ہے، دوسرے کلمہ من جو ہر نمازی پر مشتمل ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی بھی نمازی کی کسی بھی طرح کی نماز فاتحہ کے بغیر نہیں ہے۔ استدلال کرنے والوں کا دعویٰ ہے کہ اس عموم میں مقتدی بھی داخل ہے اور مقتدی کی نماز بھی فاتحہ کی قرأت کے بغیر صحیح نہیں ہے۔ اگر عموم کا یہ دعویٰ درست ہے تو ان لوگوں کے لیے استدلال کی گنجائش ہے اور اگر یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا تو ان کی بات کمزور ہے، اب ہمیں انصاف کے ساتھ یہ دیکھنا ہے کہ اس روایت کے عموم میں مقتدی کو داخل ماننے کی بات میں کتنا وزن ہے؟

منصفانہ جائزے کی ضرورت اور اس کی بنیادیں

منصفانہ جائزے کی ضرورت اس لیے محسوس ہو رہی ہے کہ امام بخاری کی ذکر کردہ حضرت عبادہؓ کی روایت ”لاصلوة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب“ قرأت خلف الامام کے بارے میں نص نہیں ہے، کیونکہ اس میں نہ مقتدی کا تذکرہ ہے، نہ خلف الامام کی قید ہے، اس لیے قرأت خلف الامام کے مسئلہ پر استدلال کرنے والوں نے بھی اپنی بات مدلل کرنے کے لیے خارجی بحثوں سے کام لیا کہ یہاں کلمہ من عام ہے، اور یہاں نکرہ نفی کے تحت ہے وغیرہ۔ اگر خلف الامام کی صراحت ہوتی تو ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی بالکل اسی طرح اس روایت کو خلف الامام کے مسئلہ سے غیر متعلق کہنے والوں نے بھی مضبوط

فی صلوة الفجر فقرا رسول الله صلى الله عليه وسلم فنقلت عليه القراءة فلما فرغ قال لعلكم تقرأون خلف امامكم قلنا نعم هذا يا رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لاتفعلوا الا بفتح الكتاب فانه لاصلوة لمن لم يقرأ بها۔ (ابوداؤد جلد ۱، ص ۱۲۲)

حضرت عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ ہم لوگ فجر کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کر رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرأت کی، تو قرأت میں آپ کو گرانی ہوئی جب آپ فارغ ہوئے تو فرمایا، کہ شاید تم لوگ اپنے امام کے پیچھے قرأت کر رہے تھے، ہم نے عرض کیا جی ہاں! بہت تیزی کے ساتھ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا۔ قرأت نہ کیا کرو، البتہ صرف سورۃ فاتحہ پڑھ سکتے ہو اس لیے کہ جو سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

نماز فجر ہی کے واقعہ میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال میں یہ ہے هل قراء معي احد منكم انفا (ترجمہ میں) کیا تم میں سے ابھی کسی نے میرے ساتھ قرأت کی ہے؟ فقال رجل نعم تو جواب میں صرف ایک شخص نے اعتراف کیا کہ جی! میں نے کی ہے۔ پھر بعض روایات میں منازعت بعض میں مخالفت کا ذکر ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تمہاری قرأت سے مجھے خلجان واقع ہونے لگا یا نماز میں کشمکش کی صورت پیدا ہو گئی۔ یہ اس روایت میں ذکر کردہ بعض الفاظ نقل کئے گئے ہیں۔ جن کی تشریح بعد میں کی جائے گی۔

حضرت شیخ الہند کا ارشاد

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک مختصر بات ارشاد فرمائی تھی کہ حضرت عبادہ کی دو روایات ہیں۔ جن میں مختصر روایت صحیح ہے، مگر وہ قرأت خلف الامام کے بارے میں صریح نہیں ہے، اور سنن کی مفصل روایت ایک درجہ میں صریح ہے مگر صحیح نہیں جبکہ دعویٰ کے ثبوت کے لیے دونوں باتوں کا جمع ہونا ضروری ہے کہ روایت اپنے مدعا پر صریح بھی ہو اور صحیح بھی ہو۔ حضرت شیخ الہند کی بات بڑی مختصر اور پسندیدہ و جامع ہے۔

خارجی قرائن ذکر کئے ہیں، اس لیے انصاف کا تقاضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک کی مراد کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے کچھ بنیادیں قائم کر لی جائیں تاکہ صحیح موازنہ کرنے اور درست فیصلے تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ زیر بحث مسئلہ کے لیے مندرجہ ذیل نقاط کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

(۱) اس روایت کے دیگر طرق اور اس کے متابعات و شواہد سے حدیث کا کیا مفہوم متعین ہوتا ہے؟

(۲) اس روایت میں بہ سند صحیح آنے والے ”فصاعدا“ کے اضافہ کے بعد کیا مطلب معین ہوتا ہے؟

(۳) اس حدیث کے راویوں نے عام طور پر روایت کو کس معنی پر محمول کیا ہے؟

(۴) اس موضوع سے متعلق قرآن کریم میں کیا ارشاد فرمایا گیا ہے؟

(۵) رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موضوع سے متعلق اس روایت کے علاوہ اور کیا ارشاد فرمایا ہے؟

(۶) رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے کس جانب کو ترجیح حاصل ہوتی ہے؟

(۷) صحابہ کرامؓ نے اس روایت سے کیا سمجھا ہے اور کیا عمل کیا ہے؟

(۸) موضوع امامت و اقتداء سے متعلق شریعت کی عام ہدایات کیا ہیں؟

اب ہم ذکر کردہ ان موضوعات سے متعلق گفتگو کو شروع کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ تفصیلی جائزے کے لیے وقت درکار ہے، اس لیے ہر عنوان کے بارے میں اختصار کے ساتھ عرض کیا جائے گا۔

(۱) حضرت عبادہ کی روایت کے دیگر طرق

اس روایت کے بارے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ دو طرح پر آئی ہے ایک مختصر اور ایک مفصل، صحاح کی مختصر روایت کے الفاظ تو آپ کے سامنے ہیں، مفصل روایت سنن میں یعنی ترمذی، ابوداؤد وغیرہ میں مذکور ہے، ابوداؤد کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

عن عبادۃ بن الصامت قال کنا خلف رسولی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور مقتدی کو سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اور مفصل روایت سے استدلال اس طرح کیا کہ دیکھئے روایت میں مخاطب ہی مقتدیوں کو کیا گیا ہے انصرء ون خلف امامکم۔ پھر انھی کو مخاطب کر کے سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کی تلقین کرتے ہوئے فانہ لاصلوۃ لمن لم یقرء بہا فرمایا گیا ہے، اس لیے مقصد ثابت ہو گیا، لیکن یہ ان کی خوش فہمی ہے، غور کیا جائے تو اسی مفصل روایت سے قرأت کا وجوب تو درکنار، قرأت کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

مفصل روایت میں منع قرأت کے قرائن

جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ مختصر روایت مفصل روایت ہی کا آخری جز تھا، اور مفصل روایت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے روایت میں ذکر کردہ تمام مضامین کا احاطہ ضروری تھا۔ روایت میں متعدد ایسے قرائن موجود ہیں جن سے مقتدی کو قرأت سے باز رہنے کی تاکید سمجھ میں آتی ہے۔ مثلاً

(الف) پہلا قریبہ تو یہ ہے کہ پورے ذخیرۂ احادیث میں ایسی ایک روایت بھی پیش نہیں کی جاسکتی جس میں پیغمبر علیہ السلام نے ابتدائی طور پر صراحت کے ساتھ مقتدی کو قرأت قرآن یا قرأت فاتحہ کا حکم دیا ہو، حضرت عبادہ کی زیر بحث روایت میں سوال و جواب کا انداز بھی یہی بتا رہا ہے کہ کسی مقتدی کو پیغمبر علیہ السلام نے قرأت کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ مقتدیوں کا یہ عمل پیغمبر علیہ السلام کے علم میں بھی نہیں تھا، بعض مقتدیوں نے اتفاقاً اپنے طور پر یہ عمل اختیار کر لیا، منازعت اور غلبان کی صورت پیدا ہو گئی تو آپ نے باز پرس فرمائی، کیا تم امام کے پیچھے قرأت کر رہے ہو، انصرء ون خلف امامکم کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرأت کا حق نہیں ہے، اور جس نے بھی یہ عمل کیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگوارگی کے ساتھ اس پر انکار فرمایا ہے۔

(ب) دوسرا قریبہ یہ ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کا عمل تمام مقتدیوں کا ہرگز نہیں ہو سکتا، کیونکہ پیغمبر علیہ السلام کی تو کوئی ہدایت نہیں، اور معاملہ ہے عبادت کا، جس میں اپنی رائے سے کوئی کام نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عبادت کے اعمال شارع علیہ السلام کی طرف سے معین کئے جاتے ہیں، اسی لیے روایات میں سوال و جواب کے الفاظ پر غور کرنے سے یہ حقیقت

مختصر روایت مفصل کا جز ہے

حضرت شیخ الہند کا ارشاد بجا، اور قرأت خلف الامام کا دعویٰ پیش کرنے والوں کے لیے مسکت جواب ہے کہ تم اپنے دعویٰ کے اثبات میں ناکام ہو، تم ہم سے صحیح اور صریح روایت طلب کرتے ہو، ہو سکے تو تم بھی اپنے مدعا کے لیے دونوں وصف کی حامل روایت پیش کرو یعنی جس کی صحت بھی مسلم ہو اور اس میں قرأت مقتدی کی صراحت بھی ہو۔

اور اصلی بات یہ ہے کہ اگرچہ محدثین کی اصطلاح کے مطابق یہ مستقل دو روایتیں ہیں، لیکن حقیقت ہے کہ روایت ایک ہی ہے، حافظ ابن حجر کو بھی اس کا اعتراف ہے، حضرت گنگوہی کا بھی یہی رجحان ہے یعنی مختصر روایت، کوئی مستقل روایت نہیں ہے بلکہ مفصل روایت کا ایک ٹکڑا ہے جسے الگ کر لیا گیا ہے اور اس کے عموم سے استدلال کیا جا رہا ہے جبکہ اصل مضمون یہ تھا کہ مفصل روایت میں یہ ٹکڑا سابق میں ذکر کردہ حکم کی علت کے طور پر لایا گیا تھا۔ لا تفعلوا الا باہام الکتاب فانہ لاصلوۃ لمن لم یقرء بہا، مطلب یہ تھا کہ امام کے پیچھے قرأت مت کرو، اور اگر پڑھنا ہی چاہتے ہو تو اباحت موجودہ کے طور پر صرف فاتحہ کی اجازت ہے اور اس کی اجازت بھی اس لیے دی جا رہی ہے کہ اس کی بہت اہمیت ہے کہ امام اور منفرد کی نماز تو اس کے بغیر ہوتی ہی نہیں، نیز یہ کہ مقتدی کے پڑھنے کی صورت میں امام سے منازعت کا امکان بہت کم ہے۔

اس تشریح کے مطابق حضرت عبادہ کی روایت کا مقصد مقتدی کے لیے فاتحہ کے وجوب کا بیان نہیں، بلکہ مقتدی کو قرأت سے منع کرنا ہے، لیکن منع کے باوجود، اباحت موجودہ کے طور پر قرأت فاتحہ کی اجازت دی گئی ہے، پھر اس اجازت کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ سورۃ فاتحہ کی مخصوص شان ہے اور وہ یہ کہ قرآن کی تمام سورتوں میں یہ امتیازی حیثیت صرف سورۃ فاتحہ کو دی گئی ہے کہ اس کی قرأت کو معین طور پر لازم کیا گیا ہے اور باقی سورتوں میں نمازی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ فاتحہ کے ساتھ جس سورت کو چاہے قرأت کے لیے منتخب کر لے۔

لیکن وجوب پر استدلال کرنے والوں نے مختصر روایت یعنی لاصلوۃ لمن لم یقرء الخ سے اس طرح استدلال کیا کہ کلمہ ”من“ عام ہے جس کے تحت تمام نمازیوں، امام منفرد

صاف ہو جاتی ہے کہ قرأت کا یہ عمل معدودے چند مقتدیوں کا ہے، بعض روایات کے الفاظ ہیں بل قرء معی احد منکم انفا (ترمذی و ابو داؤد) کیا میرے ساتھ ابھی تم میں سے کسی نے قرأت کی ہے، سوال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام جانتے ہیں کہ یہ عمل سب کا نہیں ہو سکتا، نہ ہے، احد، یا من احد کا لفظ ہے جو کمرہ غیر معین پر دلالت کرتا ہے، پھر جواب پر غور کیجیے، بعض روایات میں تو قال بعضهم نعم وقال بعضهم لا ہے۔ لیکن بعض روایات میں تو فقال رجل نعم یا رسول اللہ، اس روایت سے تو یہ معلوم ہوا کہ قرأت کرنے والا صرف ایک مقتدی تھا۔

(ج) تیسرا قرینہ یہ ہے کہ قرأت کرنے والے مقتدی بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے غلطی کی، وہ یہ نہیں کہتے کہ یا رسول اللہ! اس میں کیا مضائقہ ہے، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں ہذا یا رسول اللہ! یا رسول اللہ! قرأت تو کی ہے، مگر بڑی تیزی اور غلت کے ساتھ منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی غلطی پر معذرت کریں۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم نے قرأت میں غلت اختیار کر کے منازعت سے اور اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کی خلاف ورزی سے بچنے کی کوشش کی ہے، اگرچہ یہ عذر حکم ورتل القرآن ترتیلا کے پیش نظر درست نہیں تھا، لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باز پرس کی تو انھوں نے یہ کہا کہ ہم نے استماع کا سلسلہ ختم نہیں کیا ہے، استماع کو بھی باقی رکھا اور جلدی جلدی قرأت کا عمل بھی کر لیا جسے ہم اپنے طور پر مستحسن سمجھ رہے تھے۔

ان قرآن کا حاصل یہ نکلا کہ پیغمبر علیہ السلام کے پیچھے اپنے طور پر قرأت کرنے والے مقتدیوں کی تعداد، معدودے چند بلکہ بعض روایات کی رو سے تو صرف ایک ہے اور جب باز پرس کی گئی تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے قرأت جلدی جلدی کی ہے، تاکہ ہمارے سننے میں اور امام کی قرأت میں نقصان واقع نہ ہو۔ ان کے جواب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنی غلطی کا دردہ اعتراف کر کے یہ توجیہ کر رہے ہیں کہ جلدی جلدی پڑھنے میں شاید غلطی میں تخفیف کا پہلو نکل آئے، پھر آپ نے کیا ارشاد فرمایا؟ انداز دیکھتے جائیے، کیا آپ نے جواب میں یہ فرمایا کہ تم نے اچھا کیا؟ نہیں! روایت میں موجود ہے لا تفعلوا الابفاتحة الكتاب الخ مطلب یہ ہے کہ جب یہ لوگ ایک چیز کو امر خیر سمجھ کر بطور خود اختیار کر بیٹھے؟

پیغمبر علیہ السلام نے دفعۃً روکنے کے بجائے تدریجاً روکنا مناسب سمجھا اور فرمایا کہ اگر ایسا ہی ہے کہ تم بھی کچھ قرأت کرنا چاہتے ہو تو خیر سورۃ فاتحہ پڑھ لیا کرو یہ بات مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت سے بالکل واضح ہے جس میں فرمایا گیا فقال ان کنتم لابد فاعلین فلیقرء احدکم فاتحة الكتاب بنفسه، یعنی اگر چاروں ناچار کچھ کرنا چاہتے ہو تو صرف سورۃ فاتحہ کو ترایا دل ہی دل میں پڑھ لیا کرو۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ میری طرف سے حکم نہیں کہ تم یہ کام کرو مگر تم نے شروع کر دیا ہے اور شروع کیا ہر بنائے رغبت، کہ قرأت کے بغیر دل نہیں مانتا تو خیر صرف فاتحہ پڑھ سکتے ہو۔ حاصل یہ نکلا کہ ابتداء مقتدی کو قرأت کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ جب باز پرس کے بعد بعض حضرات کی شدید رغبت کا احساس ہوا تو ناپسندیدگی کے اظہار کے ساتھ اباحت موجودہ کے طور پر فاتحہ کی قرأت کی اجازت دے دی گئی، اس کو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا ہے کہ نبی سے استثناء مفید اباحت ہوتا ہے، لیکن یہاں مضبوط قرآن کی بنیاد پر اس کو اباحت موجودہ ہی قرار دیا جائے گا۔ وجوب کے استنباط کا یہاں تک کوئی قرینہ نہیں ہے۔

کیا وجوب کا کوئی اور قرینہ ہے؟

البتہ شواہد اور زمانہ حال کے اہل حدیث کہہ سکتے ہیں کہ اگر حدیث کے الفاظ میں صرف لا تفعلوا الابفاتحة الكتاب ہوتا آگے کچھ نہ ہوتا تو آپ کے ذکر کردہ قرآن کی بنیاد پر اباحت کی بات قابل قبول ہو سکتی تھی لیکن ذرا آگے دیکھیے، حدیث کے الفاظ ہیں فانہ لاصلوۃ لمن لم یقرء بها، کہ جو فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز ہی نہیں ہوتی، یہ الفاظ، سابق میں ذکر کردہ حکم یعنی قرأت فاتحہ کی اجازت کی دلیل کے طور پر ارشاد فرمائے گئے ہیں، اور دلیل بتا رہی ہے کہ فاتحہ مقتدی کے حق میں بھی ضروری ہے یا فرض ہے۔ لیکن حقیقت کی تنقیح کے لیے حدیث پاک کے اس آخری جملہ پر کئی طرح غور کرنا ضروری ہے۔ مثلاً:

(الف) دعویٰ اور دلیل میں مطابقت:

ہم عرض کریں گے کہ ہاں اس سے دھوکا ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کس دعوے کی دلیل ہے؟ ایک تو وہ دعویٰ ہے کہ جس کا پیغمبر علیہ السلام کے کام میں کوئی ذکر یا

(ب) لمن لم يقرأه كما مصداق کون ہے؟

قرینہ نہ ہو اور جسے آپ خود قائم اور متعین کر لیں کہ مقتدی پر بھی فاتحہ فرض ہے اور پھر اس دعوے پر دلیل کو منطبق کریں، یہ بات تو قرین انصاف نہیں ہے۔

دوسرے وہ دعویٰ ہے جسے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الفاظ سے سمجھا جائے پھر اسی کو دلیل پر منطبق کیا جائے تو یہ بات قرین انصاف اور معقول ہوگی، پیغمبر علیہ السلام کے کلام سے اباحت مروجہ کا دعویٰ مستطب ہوا تھا کہ اگر تمہارا دل قرأت کے بغیر نہیں مانتا (ان کستم لابد فاعلین الخ) تو صرف سورۃ فاتحہ کی اجازت ہے، یا یہاں لاتفعّلوا الابفاتحة الكتاب فرمایا گیا ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے لاتدخلوا بیوت النبی الا ان یؤذن لکم (اتزاب ۵۳) کہ پیغمبر علیہ السلام کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرؤ الا یہ کہ تم کو اجازت دے دی جائے، جیسے یہاں اجازت کے بعد داخل ہونا لازم نہیں صرف اباحت ہے، اسی طرح لاتفعّلوا کی نہی کے بعد الابفاتحة الكتاب کا استثناء صرف اباحت بتا رہا ہے۔

اب بات یہ ہوئی کہ فسانہ لاصلوٰۃ الابیہا، دلیل تو ہے، مگر دلیل وجوب فاتحہ کی نہیں اس لیے کہ وجوب کا دعویٰ سابق میں نہیں کیا گیا ہے، سابق میں دعویٰ اباحت کا بلکہ اباحت مروجہ کا ہے تو یہ اسی کی دلیل بنے گی۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مقتدی کو قرأت سے منع کر دیا گیا، ناگواری ظاہر کی گئی تو سورۃ فاتحہ کو اباحت مروجہ کا درجہ دینا بھی محتاج دلیل ہو گیا یعنی جب امام کے پیچھے قرأت کی ضرورت نہیں رہی تو سورۃ فاتحہ کی کیا خصوصیت ہے کہ اس کو کسی بھی درجہ میں مباح قرار دیا جائے، چنانچہ فرمایا گیا کہ اس کی ایک ممتاز شان ہے کہ نماز میں فاتحہ علی سبیل التعین مطلوب ہے جبکہ قرآن کی دوسری سورتوں کا یہ حکم نہیں، اسی مضمون کو حضرت عبادہؓ کی دارقطنی و حاکم وغیرہ کی ایک مرفوع روایت میں ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے ام القرآن عوض عن غیرها ولیس غیرها منها بعوض کہ سورۃ فاتحہ دیگر سورتوں کا بدل بن جاتی ہے لیکن کوئی دوسری سورت فاتحہ کا عوض نہیں بنتی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ فسانہ لاصلوٰۃ الخ میں سورۃ فاتحہ کی خصوصیت اور امتیازی شان بیان کی گئی ہے تاکہ مقتدی کو قرأت سے ممانعت کے باوجود، فاتحہ کے سلسلے میں دی گئی اباحت کا سبب معلوم ہو جائے جبکہ شوافع نے اس آخری جملے سے یہ سمجھ لیا کہ فاتحہ بحق مقتدی ضرور ہے، حالانکہ ضرورت اور وجوب سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

دوسری بات یہ کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے لمن لم یقرأ بهاس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے جس نمازی کو قرأت فاتحہ کا مکلف بنایا ہے وہ قرأت نہ کرے، یعنی فاتحہ کو چھوڑ کر باقی پورا قرآن پڑھ جائے تو شریعت کی نظر میں اس کی نماز کا عدم اور واجب الاعادہ ہے، رہی یہ بات کہ قرأت فاتحہ کا مکلف کس کو بنایا گیا ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے کہ اس سلسلے میں کسی کو اپنی طرف سے کہنے کا حق نہیں، یہ بات تو انہی سے پوچھنے کی ہے جنہوں نے لاصلوٰۃ لمن الخ فرمایا ہے جیسا کہ تمام اختلافی معاملات میں فان تنازعتم فی شئی فردوه الی اللہ والرسول (النساء ۵۹) کے مطابق خدا اور رسول خدا کی طرف رجوع کرنے کا حکم ہے، ہم نے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ امام اور مفرد کو اس کا مکلف بنایا گیا ہے، مقتدی سے اس کا تعلق نہیں، مقتدی کے لیے تو حدیث صحیح میں فرمایا گیا ہے اذا قسرو فانصتوا اور قرآن کریم میں بھی اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کہہ کر مقتدی کو قرأت سے روکا گیا ہے، حضرت جابرؓ سے ترمذی شریف میں اور طحاوی شریف میں روایت ہے من صلی رکعة لم یقرأ فیہا بام القرآن فلم یصل الا ان یکون وراء الامام هذا حدیث حسن صحیح (ترمذی جلد ۱، ص ۱۷۱) الا ان یکون وراء الامام میں تصریح ہے کہ سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی مگر اس حکم کا تعلق، مقتدی کے علاوہ دیگر نمازیوں سے ہے۔

ان روایات پر اور قرآن کریم کی آیت پر بحث تو بعد میں ہوگی، مگر ان باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ شریعت میں انفراد، امامت اور اقتداء کے ابواب الگ الگ ہیں، حضرت عبادہ کی روایت میں لمن لم یقرأ کو عام قرار دے کر مقتدی کو اس کے تحت داخل کرنا، ایک باب کے احکام کو دوسرے باب پر نافذ کرنے کے مرادف ہے۔

شریعت میں اس کی متعدد نظیریں ہیں، مثلاً بیع ہے شریعت نے اس کے اصول مقرر فرمائے ہیں لیکن بیع سلم کو اس سے مستثنیٰ کر کے مستقل حیثیت دی گئی ہے، اب اگر کوئی بیع سلم پر مطلق بیع کے احکام نافذ کرے تو بیع سلم ختم ہو جائے، اسی طرح شریعت میں ایک اصول مقرر ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر کسی کی ملک میں تصرف کرنا جائز نہیں، لیکن

اگر مقتدی قرأت کرے گا تو اس کی ایک نماز میں دو قرأتیں ہو جائیں گی اور یہ غیر مشروع ہے۔

(د) سیاق و سباق سے وجود نہیں نکلتا:

چوتھی بات حضرت علامہ کشمیریؒ نے ارشاد فرمائی ہے کہ فائده لاصلوٰۃ لمن یقرء بہا کا مقتدی پر فاتحہ کے وجوب سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو اس کو زمانہ ماضی میں واجب قرار دیے جانے کی خبر کہا جائے گا، یا یہ کہا جائے گا کہ پہلے تو واجب نہیں تھا، خطاب کے وقت زمانہ حال میں واجب کیا جا رہا ہے اور یہ دونوں احتمال درست نہیں، کیونکہ اگر یہ زمانہ ماضی کی خبر ہے تو صحابہ کرام سے اس سوال کا کیا موقع ہے کہ شاید تم قرأت کر رہے تھے، پھر یہ کہ اگر سوال کی کوئی وجہ ایجاد بھی کر لی جائے تو صحابہ کو جواب میں معذرت یا شرمندگی کی کیا ضرورت ہے، تمام صحابہ کو بیک زبان یہ کہنا چاہیے تھا کہ یا رسول اللہ! اس کی قرأت کو تو آپ نے ضروری قرار دیا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا، یہ سوال و جواب بتا رہا ہے کہ زمانہ ماضی میں تو اس کو کسی وقت بھی ضروری قرار نہیں دیا گیا تھا، دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کو زمانہ حال میں ضروری قرار دیا جا رہا ہو تو اس صورت میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اسی وقت ضروری قرار دیا جا رہا ہے اور اسی وقت ناگواری کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے، ایسی صورت ہوتی تو آپ کو صحابہ کرام کے اس عمل پر ہمت افزائی کرنی چاہیے تھی کہ ضروری تو اب ہم قرار دے رہے ہیں لیکن تم شریعت کے ایسے مزاج شناس ہو کہ پہلے ہی وہ کام شروع کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، اور جب نہ زمانہ ماضی میں ضروری قرار دینے کی کوئی صحیح توجیہ ہو رہی ہے نہ حال میں تو کیسے سمجھا جائے کہ فائده لاصلوٰۃ کا تعلق مقتدی پر فاتحہ کے وجوب سے ہے۔ پھر یہ کہ اتنے بڑے دعوے کے لیے۔ یعنی زمانہ ماضی یا زمانہ حال میں فاتحہ کو واجب کہنے کے لیے حدیث پاک سے کوئی ثبوت تو پیش کرو، ایسا ہوا ہوتا تو ضرور ذخیرہ حدیث میں کوئی چیز محفوظ ہوتی؟

ان چاروں باتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ حدیث کا آخری جملہ فائده لاصلوٰۃ لمن لم یقرء بہا مقتدی پر فاتحہ کے وجوب کی دلیل نہیں، اس لیے کہ وجوب کا دعویٰ کیا ہی نہیں گیا ہے صرف اباحت کا دعویٰ مستحب ہوتا ہے یہ اسی کی دلیل ہے کہ مقتدی کو قرأت کی اجازت نہیں البتہ سورہ فاتحہ کو امتیازی شان کی وجہ سے مباح کر دیا گیا ہے، نیز یہ کہ روایات صحیحہ کی

شفعہ کو الگ حیثیت دی گئی ہے، ایک شخص نے مکان خریدنا بیع نام ہو گئی وہ مالک ہو گیا، لیکن دوسرا آدمی شفعہ کے حق کی بنیاد پر زبردستی دوسرے کے حق میں تصرف کا دعوے دار ہو گیا، یہی کہا جائے گا کہ شریعت نے دو الگ الگ ابواب قائم کئے ہیں اور ایک باب کے احکام دوسرے باب پر نافذ کرنا شریعت کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنا ہے، اسی طرح اقتداء کا باب بالکل الگ ہے اور حدیث کے الفاظ لمن لم یقرء بہا کی تشریح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ احکام کے مطابق یہی ہے کہ مقتدی سے قرأت فاتحہ کا تعلق نہیں۔

(ج) مقتدی کے قاری ہونے کا مطلب:

تیسری بات یہ ہے کہ حدیث میں جو لمن لم یقرء فرمایا گیا ہے تو آپ نے یہ کیسے سمجھا کہ استماع و انصات کے حکم کی تعمیل کرنے والا مقتدی قاری نہیں ہے؟ ظاہر ہے آپ کا یہ سمجھنا معنی لغوی کی بنیاد پر ہے کہ قاری وہ ہے جو قرأت کرے، ہم عرض کریں گے کہ امور شرعیہ میں معنی لغوی پر اعتماد بھی اگرچہ صحیح ہے مگر پیغمبر علیہ السلام کی زبان سے شریعت میں بیان کردہ معانی کو اذیت حاصل ہے اس لیے ہم نے لغت کے بجائے اس سلسلہ میں پیغمبر علیہ السلام کی طرف رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ مقتدی کو خاموشی کی حالت میں بھی قاری مانا گیا ہے، من کان له امام فقراء الامام له قراءۃ روایت پر گفتگو بعد میں آئے گی، اسی طرح موطا میں ابن عمرؓ کا ارشاد موجود ہے اذا صلی احدکم خلف الامام فحسبہ قراءۃ الامام۔ پیغمبر علیہ السلام کے ارشادات کا حاصل یہ ہے کہ مقتدی کو خاموشی کی حالت میں بھی قاری تسلیم کیا گیا ہے جیسے باکرہ سے نکاح کی اجازت طلب کرتے ہیں تو وہ شرم و حیا کی وجہ سے زبان سے کچھ اظہار نہیں کرتی، مگر اس فطری عذر کے سبب اس کے سکوت کو تکلم کی طرح تسلیم کیا گیا ہے، قاری میں آئے گا، فقیل یا رسول اللہ کیف اذنها قال اذا سکت (بخاری جلد ۲، ص ۱۰۳۰)

اسی بات کو شیخ ابن تیمیہؒ نے اپنے انداز میں اس طرح لکھا ہے بل یقال بالقراءۃ ثابتہ من المقتدی شرعاً فان قراءۃ الامام قراءۃ له فلو قراء کان له قراءتان فی صلوٰۃ واحده وهو غیر مشروع (فتح القدیر ج ۱، ص ۲۹۵) بلکہ یہ کہا جائے گا کہ مقتدی کا قاری ہونا شرعاً ثابت ہے اس لیے کہ امام کی قرأت کو مقتدی کی قرأت تسلیم کیا گیا ہے پس

(ج) پھر یہ کہ جہر کی بنیاد پر انکار کیا گیا ہوتا تو پیغمبر علیہ السلام قرأت کے بارے میں شبہ کا اظہار کرتے ہوئے لعلکم تقرون باہل قراء وغیرہ نہ فرماتے، کیونکہ جہر کی تو آواز ہوتی ہے جس سے قرأت کا یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں صرف قاری کے تعین کے بارے میں سوال کیا جاسکتا تھا یعنی سوال ہونا چاہیے تھا من قرء یا من جہر، کہ قرأت کون کر رہا تھا وغیرہ۔

(د) مزید یہ کہ عقلاً بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ سب مقتدی خاموش ہوں اور ایک دو آدمی جہر شروع کر دیں، صحابہ کرام سے اس طرح کی امید نہیں کی جاسکتی۔

یہ باتیں تو پہلی تاویل کے بارے میں ہوئیں، دوسری تاویل کے انکار سے فاتحہ کی قرأت پر نہیں بلکہ مازاد کی قرأت پر ہے، تو یہ بات بھی متعدد وجوہ کی بنا پر قابل قبول نہیں ہے۔ مثلاً:

(الف) پہلی بات تو یہ ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد لعلکم تقرون خلف امامکم میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ہے جس کی بنیاد پر آپ کے انکار کا تعلق مازاد سے قائم کیا جائے، شاید اس تاویل کو پیش کرنے والوں کی نظر حضرت عمران بن حصین کی اس روایت پر ہے جس میں کسی نے ظہر کی نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سبح اسم ربک الاعلیٰ کی قرأت کی تھی اور آپ نے ایسکم قراء کہہ کر انکار فرمایا تھا، مگر اس استدلال کی حیثیت غلط فہمی سے زیادہ نہیں۔

کیونکہ آپ کے انکار کی وجہ سبح اسم یا کسی سورۃ کی قرأت نہیں، روایات کے اکثر اور قابل اعتبار طرق میں مدار انکار مطلق قرأت کو بنایا گیا ہے، پھر یہ کہ یہاں دو واقعات الگ الگ ہیں، حضرت عبادہ کی زیر بحث روایت کا تعلق نماز فجر سے ہے اور حضرت عمران کی روایت جس میں سبح اسم الخ کی قرأت کا ذکر ہے۔ کا تعلق نماز ظہر سے ہے جو سری ہے۔

سری نماز میں سبح اسم الخ کے جہر کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ جہر یا مسازاد علی السفاحۃ سے انکار کا تعلق قائم کیا جائے صاف بات یہی ہے کہ کسی مقتدی کے ارتکاب کراہت۔ یعنی قرأت خلف الامام۔ کی بنیاد پر انکار فرمایا گیا، جیسے بعض روایات میں یہ آتا ہے کہ کسی مقتدی کی طہارت کے سلسلے میں کوتاہی کا آپ کے قلب مبارک پر اثر ہوا اور

روشنی میں اس کا تعلق مقتدی سے نہیں ہے مزید یہ کہ مقتدی سے قرأت کا تعلق اگر ہے تو اس سے حتیٰ اور لغوی قرأت مراد نہیں، بلکہ شرعی قرأت مراد ہے، پھر یہ کہ واجب قرار دیتے ہیں، تو حدیث کے سیاق و سباق سے زمانہ ماضی یا حال میں اس کی تائید تو کیا ہوتی اس اشکال کی جواب دہی دشوار نظر آتی ہے کہ ایک طرف واجب بھی قرار دیا جائے اور دوسری طرف قرأت کا عمل کرنے والے مقتدیوں کے عمل پر اظہار ناگواری کے ساتھ انکار بھی کیا جائے؟

بیہی کی تاویل

یہاں یہ بات بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے پر جن روایات میں اظہار نا پسندیدگی کیا گیا ہے، بیہی وغیرہ نے ان کی دو تاویلیں کی ہیں، ایک تاویل تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری کا اظہار قرأت پر نہیں کیا بلکہ جہر پر کیا ہے، گویا ناگواری کا اظہار اصل قرأت پر نہیں بلکہ قرأت کے وصف پر ہے اور دوسری تاویل یہ کہ ناگواری کا اظہار قرأت فاتحہ پر نہیں مازاد علی السفاحۃ پر ہے لیکن اس طرح کی تاویلات کو بات بنانے کی کوشش سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ مثلاً پہلی تاویل کے بارے میں مندرجہ ذیل حقائق کا پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

(الف) ایک بات تو یہ ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الفاظ لعلکم تقرون خلف امامکم ہیں، لعلکم تجہرون خلف امامکم نہیں ہیں، یعنی آپ کے الفاظ سے ناگواری کا اظہار جہر پر نہیں بلکہ صراحت کے ساتھ نفس قرأت پر ثابت ہوتا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ناگواری کی بنیاد منازعت ہے لیکن منازعت کے لیے مقتدی کی جانب سے جہر کا ہونا ضروری نہیں، پھر ہم بے ضرورت تقرون کو تجہرون کے معنی پر کیوں محمول کریں؟

(ب) نیز یہ کہ انکار کا مدار جہر کو قرار دیں تو فطری طور پر پہلے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ پیغمبر علیہ السلام نے مقتدی کو سری قرأت کی اجازت دی تھی، اگر یہ ہدایت کہیں موجود ہو تو چلے جہر ہی کو مدار انکار بنالیا جائے، اور اگر یہ ہدایت ذخیرۃ احادیث میں نہیں ہے تو نفس قرأت کی صراحت کے بارے میں جہر کو کیسے مدار قرار دیا جائے؟

آپ نے ارشاد فرمایا ما بال اقوام يصلون معنا لا يحسنون الطهور و انما يلبس علينا القرآن أولئك۔

(ب) دوسری بات یہ ہے کہ انکار کو مازاد سے متعلق قرار دینا، محض احتمال کی بنیاد پر تو ثابت نہیں ہوتا، یہ تو ایک دعویٰ ہے جو روایت کے سیاق و سباق کے منافی ہے اور اس طرح کے دعوؤں کو ثابت کرنے کے لیے مضبوط دلیل کی ضرورت ہے، اور یہاں مضبوط تو کجا، ضعیف دلیل بھی نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبادہ کی روایت سے مقتدی کے لیے فاتحہ کا وجوب کسی بھی طرح ثابت نہیں ہوتا، صرف ابا حاتم مروجہ نکل سکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کے پیچھے قرأت کرنے والوں کو اظہار بنا راضگی کے ساتھ اجازت دی ہے لیکن وجوب کا قول اختیار کرنے والوں نے اپنی فہم سے ایک نظریہ قائم کر لیا پھر اس پر روایات کو منطبق کرنے کے لیے تکلف بلکہ زبردستی سے کام لیا، اور جو دلائل اپنے نظریہ کے خلاف نظر آئے ان میں بیجا تاویل شروع کر دی۔

(۲) حضرت عبادہ کی روایت میں فصاعداً کا اضافہ

یہاں تک کے مضمون کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عبادہ کی مختصر روایت کو مفصل روایت کی روشنی میں سمجھنے سے یہ ثابت ہوا کہ اس روایت سے مقتدی کے حق میں فاتحہ کے وجوب پر استدلال کرنا درست نہیں، اب اس روایت پر ایک اور زاویہ سے غور کرنا ہے اور وہ یہ کہ روایت کے الفاظ صرف لا صلوة الا بفتح الکتاب ہیں یا اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہے، تو مسلم، ابوداؤد اور ابن حبان میں اس کے بعد لفظ فصاعداً بھی ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اس اضافہ کے بعد ظاہر ہے کہ لا صلوة کا حکم صرف سورہ فاتحہ سے نہیں بلکہ مجموعہ سے متعلق مانا جائے گا اور نفی صلوة کا تعلق صرف ترک فاتحہ سے نہیں، بلکہ مجموعہ کے ترک سے ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ نماز میں مطلق قرأت مطلوب ہے جیسا کہ قرآن میں فساقروا ماتیسر من القرآن، اور مسی فی الصلوة کی روایت میں ثم اقرا ماتیسر معک من القرآن فرمایا گیا ہے۔ البتہ اس مطلق قرأت میں یہ تفصیل ہے کہ سورہ فاتحہ معین ہو کر لازم

کی گئی ہے اور فصاعداً یا ماتیسر میں غیر معین طور پر یہ اختیار دیا گیا ہے کہ نمازی کسی بھی سورت کو یا قرآن کریم کے کسی بھی حصے کو فاتحہ کے ساتھ شامل کر سکتا ہے، گویا مطلق قرأت کی تفصیل میں جو درجہ سورہ فاتحہ کو دیا جائے گا وہی درجہ ضم سورت کو بھی دیا جائے گا جیسا کہ حنفیہ نے دونوں کو واجب قرار دیا ہے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک ہی سیاق میں دو چیزوں کو عطف کے ساتھ ذکر کیا جائے اور ان دونوں کے درجہ میں فرق کر دیا جائے یہ کیسے ممکن ہے کہ لا صلوة کو سورہ فاتحہ کے حق میں رکیت کی دلیل قرار دیا جائے اور فصاعداً کے حق میں وہ رکیت کی دلیل نہ بنے، جیسا کہ شوافع نے کر رکھا ہے۔ سچ پوچھئے تو جن لوگوں نے معطوف علیہ میں نفی ذات، اور معطوف میں نفی کمال کے معنی لیے انھوں نے صحیح معنی میں روایت پر عمل نہیں کیا اور نہ عربی زبان کے قواعد مطرودہ کی رعایت کی، روایت پر عمل انھی لوگوں نے کیا جنھوں نے سوق کلام اور عربی زبان کے قواعد کے مطابق روایت کے دونوں اجزاء کو برابر کے درجہ میں رکھا اور سورہ فاتحہ کے ساتھ فصاعداً کو بھی واجب قرار دیا۔

اور جب روایت کا یہ مفہوم متعین ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کے ساتھ ضم سورت کو بھی لازم کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ اس روایت کا تعلق ایسے نمازی سے نہیں جس کو صرف سورہ فاتحہ کی۔ اور وہ بھی ناگواری کے ساتھ۔ اجازت دی گئی ہے، یعنی اب دیانت کے ساتھ غور کیجئے کہ ان معافی کی وضاحت کے بعد روایت کا کیا رخ متعین ہوا؟ اور کیا روایت کو مقتدی سے متعلق قرار دیا جاسکتا ہے، جسے شوافع کے یہاں فاتحہ پڑھنے کی اجازت ہے فصاعداً کی نہیں۔

اضافہ پر رد و اعتراض

فصاعداً کے اضافہ کے بعد روایت کا تعلق مقتدی سے قائم ہی نہ رہا، تو اس اضافہ پر بحث شروع ہو گئی، امام بخاری نے جزء القراءة میں اس پر رد و اعتراض کئے ہیں، پھر دوسرے علماء بھی انہی کو نقل کرتے رہے ہیں۔

ایک اعتراض تو یہ ہے کہ عامة الثقات لم تنابع معمر الخ کہ عام طور پر ثقہ راویوں نے معمر کی متابعت نہیں کی اور فصاعداً غیر معروف ہے یعنی معمر اس روایت میں متفرد ہیں دوسرا اعتراض یہ کہ اگر اس لفظ کو کسی درجہ میں تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ استعمال بالکل

سفیان عن الزہری عن محمود بن الربیع عن عبادۃ بن الصامت يبلغ به النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا صلوة لمن لم یقرء بفاتحة الكتاب فصاعداً، قال سفیان لمن یصلی وحده (ابوداؤد جلد ۱، ص ۱۱۹) سند کے تمام رجال ثقہ اور صحیح کے راوی ہیں، اب زہری سے فصاعداً کی روایت کرنے والے دو امام ہو گئے، ایک معمر اور دوسرے سفیان بن عیینہ۔

پھر یہ کہ انھی دو پر انھار نہیں بلکہ امام اوزاعی، شعیب بن ابی حمزہ، عبد الرحمن بن اسحاق مدنی اور صالح بن کیسان نے بھی فصاعداً کی نقل میں ان کی متابعت کی ہے، حضرت غلامہ کشمیریؒ نے فصل الخطاب میں ان متابعات کو حوالوں کے ساتھ نقل فرمایا ہے، اتنے راویوں کی متابعت کے بعد معمر کے تفرک کا دعویٰ کیسے قابل قبول ہو سکتا ہے۔

(ج) تیسری وجہ یہ ہے کہ ذخیرۃ احادیث میں فصاعداً کے شواہد بہ کثرت موجود ہیں، ابوسعید خدری سے ابوداؤد میں امرنا ان نقرأ بفاتحة الكتاب وما تيسر اور حضرت ابو ہریرہؓ سے امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان انادی انه لا صلوة الا بقراءة فاتحة الكتاب وما زاد (ابوداؤد جلد ۱، ص ۱۱۸) موجود ہے، ترمذی اور ابن ماجہ میں وسورۃ معھا کے الفاظ ہیں اور ابویہ کی کتاب القراءة میں اس کے ہم معنی متعدد الفاظ منقول ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ فصاعداً کے اضافہ کو محدثین کے اصول کے مطابق صحیح قرار دینا ضروری ہے کہ اس کے راوی ائمہ حدیث ہیں، اس کی متابعات اور اس کے شواہد اتنی کثرت سے موجود ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے اس کی صحت میں شبہ کرنا اصولی محدثین سے انحراف کے ہم معنی ہے، امام بخاری کی طرف سے یہ عذر کیا جاسکتا ہے کہ وہ ان متابعات پر مطلع نہیں تھے، نیز یہ کہ اس زمانہ میں اصول حدیث بھی پوری طرح مدوّن نہیں ہوئے تھے۔ لیکن شوافع اور عہد حاضر کے اہل حدیث جو آج تک اس اعتراض کو دہراتے رہتے ہیں تو ہم اس کی معقولیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ واللہ اعلم۔

دوسرے اعتراض کا جواب

دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ فصاعداً کو اگر تسلیم بھی کر لیں تو یہ لا تقطع الید الا فی

لا یقطع الید الا فی ریع دینار فصاعداً کی طرح ہے کہ چوری کی سرانجام دینا میں بھی قطع ید ہے اور اس سے زائد میں بھی قطع ید ہے یعنی حد سرقہ کے اجراء کے لیے مالیت کا ریع دینار ہونا ضروری ہے، اس سے زیادہ غیر ضروری ہے، اسی طرح لا صلوة الا الخ میں نماز کی تمامیت کے لیے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے، فصاعداً غیر ضروری ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب

فصاعداً پر کئے گئے اس اعتراض کو محدثین کے طے کردہ اصول کے مطابق کسی طرح کی اہمیت نہیں دی جاسکتی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) راوی کا تفرک اس صورت میں مضطر قرار دیا گیا ہے جب ثقہ راوی کی روایت اوثق کے مخالف ہو اور یہاں ایسا نہیں ہے، معمر بن راشد کے بارے میں ابن معین فرماتے ہیں ہسو اثبت الناس فی الزہری، امام زہری کے تلامذہ میں معمر مضبوط تر راویوں میں ہیں۔ علی بن مدینی اور ابو حاتم فرماتے ہیں ہو فیمن دار الاسناد علیہم (تہذیب جلد ۱، ص ۲۳۴) یہ ان مرکزی راویوں میں ہیں جن پر اسناد کا مدار ہے، اس لیے اگر وہ متفرد بھی ہوں تو ان کی روایت کو اصول محدثین کے مطابق قبول کرنا ضروری ہے، چنانچہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ روایت معمر ہی سے نقل فرمائی ہے۔

(ب) دوسری بات یہ کہ معمر متفرد نہیں ہیں، ایک متابعت تو خود امام بخاری نے جزء القراءة میں ذکر کی ہے قال البخاری ویقال ان عبد الرحمن بن اسحاق تابع معمر السخ (جزء القراءة ص ۴) اگرچہ امام بخاری نے اس متابعت کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ عبد الرحمن بن اسحاق کبھی زہری سے بلا واسطہ نقل کرتے ہیں اور کبھی بالواسطہ اور ہم نہیں جانتے کہ ہذا من صحیح حدیثہ ام لا یعنی یہ متابعت ان کی صحیح حدیثوں میں سے ہے یا نہیں؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر امام بخاری کو سند صحیح سے متابعت مل جاتی تو وہ اس کو قبول کر لیتے، اگرچہ اصول محدثین میں متابعت کا یہ سند صحیح ہونا ضروری نہیں، متابعت میں اگر کچھ کمزوری بھی ہو تو اس کو رد نہیں کیا جاتا۔ لیکن سند صحیح کے ساتھ متابعت کی قید ہے تو وہ بھی موجود ہے، ابوداؤد میں ہے۔ حدثنا قتیبة بن سعید وابن السرح قالانا

ربیع دینار فصاعداً کی طرح ہے، امام بخاری نے اس مثال کے ذریعہ اپنا طریقہ استدلال پوری طرح واضح نہیں کیا، صرف اتنا لکھا فقد یقطع البدلی دینار و فی اکثر من دینار کہ پور کا ہاتھ ایک دینار میں بھی کاٹا جاتا ہے اور ایک دینار سے زائد میں بھی، اس کی وضاحت یہ ہے کہ فصاعداً حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور اس کا استعمال لغت عرب میں ایسے موقع پر ہوتا ہے جب ذکر کردہ حکم کو ماقبل میں ضروری اور مابعد میں اختیاری قرار دیا گیا ہو جیسے لا تقطع البدلی لافی ربیع دینار فصاعداً کہ چور کا ہاتھ کاٹنے کے لیے ربیع دینار کی چوری تو ضروری ہے فصاعداً یعنی ربیع دینار سے زیادہ ہو یا نہ ہو، اسی طرح لاصلوۃ الابفاتحة الكتاب فصاعداً میں سورہ فاتحہ کی قرأت ضروری ہے، فصاعداً یعنی سورہ فاتحہ کے علاوہ قرأت ہو یا نہ ہو۔

لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ نے لغت عرب سے جو فصاعداً استعمال پیش کیا ہے کہ وہ ماقبل میں حکم کے ایجاب اور مابعد میں تخیر کے لیے آتا ہے یہ استعمال ہر جگہ مطرد نہیں ہے، مثلاً حضرت علیؓ سے روایت میں قال امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نستشرف العین والاذن فصاعداً، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم قربانی کے جانور کے آنکھ اور کان، پھر اس سے زیادہ کو یعنی دیگر اعضاء کو دیکھ لیا کریں کہ ان میں عیب تو نہیں ہے، تو کیا مندرجہ بالا استعمال کی رو سے یہ معنی درست ہوں گے کہ آنکھ اور کان کے عیب سے خالی ہونے کو دیکھنا تو ضروری ہے، اور دیگر اعضاء میں اختیاری؟ ظاہر ہے کہ یہ معنی نہیں ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح آنکھ اور کان کا غور سے دیکھنا ضروری ہے، اسی طرح دیگر اعضاء کے بھی عیب سے سالم ہونے کو دیکھنا ضروری ہے۔

اس لیے صحیح بات ہے کہ کلام عرب میں فصاعداً ماقبل کے حکم خواہ وہ وجوب ہو یا اباحت ہو یا تخیر ہو وغیرہ۔ کو مابعد تک ممتد کرنے کے لیے آتا ہے یعنی یہ بتلانے کے لیے آتا ہے کہ مابعد بھی ماقبل ہی کے حکم میں داخل ہے، اور یہ بات فصاعداً کے تمام استعمالات میں مطرد ہے استعمال کی اس وضاحت کے مطابق لاصلوۃ الابفاتحة الكتاب فصاعداً کے معنی یہ ہوئے کہ نماز میں ماقبل کے حکم میں مابعد بھی داخل ہے یعنی سورہ فاتحہ کا جو حکم ہے وہی فصاعداً کا بھی ہے کہ مثلاً حنفیہ کے یہاں یہ دونوں واجب ہیں۔

اس تفصیل سے وہ مغالطہ دور ہو جاتا ہے جو امام بخاری کی پیش کردہ لاقطع الایدی الخ والی مثال سے پیدا ہوتا ہے، حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ نے تو اس کے کئی تحقیقی جوابات دیئے ہیں اور ہماری پیش کردہ تفصیل بھی دراصل انھی کے بیان کردہ ایک

اس تفصیل سے وہ مغالطہ دور ہو جاتا ہے جو امام بخاری کی پیش کردہ لاقطع الایدی الخ والی مثال سے پیدا ہوتا ہے، حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ نے تو اس کے کئی تحقیقی جوابات دیئے ہیں اور ہماری پیش کردہ تفصیل بھی دراصل انھی کے بیان کردہ ایک

قرات بسورۃ کذا میں ذہانت و فطانت رکھنے والوں کے لیے بڑا فرق ہے قرات سورۃ کذا کا مطلب یہ ہے کہ صرف وہی معین سورت پڑھی جس کا نام لیا گیا ہے، اس کے ساتھ اور کوئی سورت نہیں پڑھی اور قرات بسورۃ کذا کا مطلب یہ ہے کہ میری قرات میں یہ سورت بھی شامل ہے یعنی تھا اس سورت کی قرات نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ اور قرات بھی کی ہے۔

پھر ابن قیم نے اس دعویٰ پر حدیث پاک سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں جن سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، پہلے استعمال قرات سورۃ کذا سے متعلق تین مثالیں ذکر کی ہیں، حضرت ابی بن کعب سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ان اللہ امرنی ان اقرأ علیک لم یکن الذین کفروا (مشکوٰۃ، ص ۱۹۰) خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ (اے ابی!) میں تمہیں لم یکن الذین کفروا پڑھ کر سناؤں، دیکھئے یہاں اقراء کا استعمال ”ہا“ کے بغیر ہے، کیونکہ یہ نماز میں قرات کا واقعہ نہیں ہے نماز سے خارج کا ہے اور اس میں صرف لم یکن الخ کی قرات ہے، اس کے ساتھ کسی اور سورت کی قرات نہیں ہے۔

اسی طرح حضرت جابر کی ایک روایت میں ہے لقد قرأتھا (سورۃ الرحمن) علی الحسن (مشکوٰۃ، ص ۸۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے سورۃ رحمن، بختات کو پڑھ کر سنائی، یہاں پر قرأتھا فرمایا ہے قرات بھا نہیں فرمایا، کیونکہ یہ بھی نماز کا واقعہ نہیں ہے، خارج صلوٰۃ میں صرف سورۃ رحمن کسی اور سورت کو ملائے بغیر پڑھ کر سنائی گئی ہے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود کی ایک روایت میں ہے قرأ النجم فسجد فیہا ومسجد من کان معہ (مشکوٰۃ، ص ۹۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ النجم پڑھی اور آیت سجدہ پر آپ نے بھی سجدہ کیا، یہاں بھی قرء والنجم فرمایا ہے بالنجم نہیں فرمایا ہے کیونکہ یہ بھی خارج صلوٰۃ کا قصہ ہے اور صرف سورۃ نجم پڑھی گئی ہے، اس کے ساتھ کوئی اور سورۃ شامل نہیں ہے۔

دوسرے استعمال قرات بسورۃ کذا کی بھی تین مثالیں دی ہیں، حضرت ابوہریرہ کی روایت میں ہے کان یقرء بالستین الی المائۃ (مشکوٰۃ، ص ۶۰) فجر کی نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ساٹھ آیتوں سے لے کر سو آیات تک پڑھتے تھے، ابوہریرہ چونکہ نماز

نیز یہ کہ امام بخاری کی پیش کردہ حدیث والی مثال میں تو صرف ایک ہی تعبیر فصاعداً کی ہے جس سے معنی مرادی کی تعین میں غلط فہمی ہو سکتی ہے اور اس کو دور بھی کر دیا گیا ہے لیکن قرات کے سلسلے میں روایات میں صرف فصاعداً ہی نہیں ہے بلکہ متابعات و شواہد میں متعدد تعبیرات موجود ہیں، حضرت ابوسعید خدری کی روایت میں بفاتحة الكتاب و مائیسر، حضرت ابوہریرہ کی روایت میں بقراءة فاتحة الكتاب و مازاد وغیرہ ہے جن میں مائیسر و مازاد کو دوا و عاطفہ کے ذریعہ فاتحہ کے حکم میں شریک کیا گیا ہے اس لیے یہاں فصاعداً کے معنی مرادی کی تعین میں کسی غلط فہمی کا امکان ہی نہیں اور قرات کے سلسلے میں یہی معنی معین ہیں کہ سورۃ فاتحہ کے حکم کو مابعد تک مسترد کر دیا گیا اور حنفیہ کے یہاں چونکہ فاتحہ کا حکم وجوب کا ہے اس لیے فصاعداً کے مصداق کو بھی واجب قرار دیا جائے گا۔

اس تفصیل کا تقاضہ یہ ہے کہ حنفیہ کے یہاں تو یہ روایت مقتدی سے متعلق ہی نہیں ہے لیکن شوافع کے یہاں بھی اس کو مقتدی سے متعلق قرار دینا ممکن نہیں کیونکہ ان کے یہاں مقتدی کے لیے صرف قرات فاتحہ کی اہمیت ہے، غیر فاتحہ سے اس کو روک دیا گیا ہے جبکہ روایت کے معنی شدہ مندرجہ بالا معنی کی رو سے ضم سورت کا بھی وہی حکم ہے جو فاتحہ کا ہے۔

بخاری کی مختصر روایت میں ضم سورت کا قرینہ

فصاعداً کے اضافہ کے بعد حضرت عبادہ کی روایت کے جو معنی متعین ہوتے ہیں، اگر غور کیا جائے تو بخاری میں ذکر کردہ مختصر روایت لا صلوة لمن لم یقرء بفاتحة الكتاب کے فصاعداً کے بغیر بھی وہی معنی ہیں۔ یعنی قواعد عربی کی رو سے صرف بفاتحة الكتاب کا بھی وہی مفہوم نکلا ہے جو فصاعداً مازاد وغیرہ میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔

حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ نے فصل الخطاب میں لکھا ہے کہ علامہ ابن قیم نے بدائع الفوائد (جلد ۲، ص ۶۷) میں ایک فصل میں یہ بحث کی ہے کہ قرات سورۃ کذا اور

عرف شریعت میں اس کے لیے بھی اسی لفظ قرأت کو اختیار کیا گیا ہے، عرف شرعی میں نقل ہونے کے ساتھ یہ لفظ متعدی نہ رہا، لازم ہو گیا اور قرء کے معنی ہو گئے فعل فعل القراءۃ کہ نمازی نے قرأت کا فعل انجام دیا اس صورت میں قرء کو مفعول بہ کی ضرورت نہیں، لیکن جب فعل قرأت کا کسی سورت سے تعلق بیان کرنا مقصود ہو تو اس کو باء کے ذریعہ متعدی کیا جاتا ہے اور اس وضع شرعی میں ایک معبودیت کی شان بھی پائی جاتی ہے اس لیے قرء بسورۃ کذا کے معنی عرف شرعی کے مطابق نہیں ہیں کہ اس نے فلاں سورت پڑھی بلکہ اس کے معنی ہیں قرء قرءۃ معہودۃ فی شرع بہذہ السورۃ، یا اوقع فعل القراءۃ المعہودۃ عند الشرع بہذہ السورۃ، یعنی قرأت کے سلسلے میں نمازی نے وہ کام کیا جو شریعت میں مقرر ہے اور جو چیز شریعت میں مقرر ہے وہ صرف فاتحہ یا صرف سورت نہیں ہے، معہود قرأت یہ ہے کہ امام فاتحہ بھی پڑھتا ہے اور اس کے ساتھ سورت بھی ملاتا ہے۔

اب اس وضاحت کے بعد امام بخاری کی پیش کردہ مختصر روایت کو سمجھئے، الفاظ ہیں لاصلوۃ لمن لم یقرء بفاتحة الكتاب، ابن قیم اس کا ترجمہ و مطلب یوں بیان کرتے ہیں معناه: لاصلوۃ لمن لم یات بہذہ السورۃ فی قراءتہ اوفی صلاتہ ای فی جملة ما یقرء بہ۔ وهذا لا یقتضی الاقتصار علیہا بل یشعر بقراءۃ غیرہا معہا۔ (بدائع الفوائد جلد ۲، ص ۷۶) یعنی روایت کے الفاظ کا پورا ترجمہ یہ نہیں ہے کہ جس نے فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی بلکہ اب ترجمہ یہ ہے کہ جس نے قرأت معہودہ میں سورۃ فاتحہ کو شامل نہیں کیا اس کی نماز نہیں ہوئی، ابن قیم فرماتے ہیں کہ اس تعبیر کا تقاضہ سورۃ فاتحہ میں قرأت کا انحصار نہیں، بلکہ اس تعبیر کا تقاضہ یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کے ساتھ سورۃ فاتحہ کے علاوہ کی بھی قرأت کی گئی ہے۔

اس تفصیل کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ اگر روایت میں بفاتحة الكتاب کے ساتھ "فصاعداً" یا "مازاداً" وغیرہ کچھ بھی نہ ہو تب بھی مطلب وہی نکلتا ہے جو مازاداً فصاعداً وغیرہ کے اضافہ کے بعد صراحت کے ساتھ مذکور ہے اور جب یہ چیز ثابت ہو گئی تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حضرت عبادہ کی روایت کا تعلق مقتدی سے نہیں، امام و منفرد سے ہے۔

نجر میں کی جانے والی تلاوت کی مقدار بیان کر رہے ہیں اس لیے بالسبعین الی المائۃ فرما رہے ہیں، مطلب یہ ہے کہ صرف ساٹھ آیات نہیں ہیں بلکہ سورۃ فاتحہ بھی ہے، گویا مجملہ تلاوت یہ ساٹھ آیات بھی ہیں۔

اسی طرح ایک روایت میں ہے قرء بسورۃ الاعراف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں سورۃ اعراف پڑھی، نماز کا واقعہ ہے اس لیے بالاعراف کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ میں سورۃ فاتحہ بھی ہے۔

اسی طرح حضرت جابر بن سرہ کی روایت میں ہے کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرء فی الفجر بق و القرآن المجید ونحوہا (مشکوٰۃ ص ۷۹) حضور صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں ق و القرآن المجید یا اس کے بقدر پڑھتے تھے، یہ بھی نماز کا واقعہ ہے اس لیے "بق" فرمایا کہ یہ تہائیں ہے بلکہ اس کے ساتھ سورۃ فاتحہ بھی پڑھی گئی ہے۔

نیز یہ کہ انھیں تین مثالوں پر انحصار نہیں ہے، ذخیرۃ احادیث بالعموم جہاں نماز میں کسی سورت کے پڑھنے کا ذکر ہے وہاں باء کا استعمال ہے بقرء فی الظہیر باللیل، بقرء فی المغرب بالطور، بقرء فی المغرب بالسرسلات، وغیرہ، اور جہاں خارج صلوة میں قرآن کی کسی سورت کو پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے وہاں باء کا استعمال نہیں ہے، آپ نے فرمایا من قرء حم الدخان فی لیلۃ اصبح یستغفر لہ سبعون الف ملک۔ (مشکوٰۃ ص ۱۸۷) حضرت نوفل بن عداویہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے پڑھنے کے لیے کچھ بتا دیجیے تو فرمایا اقرأ قل یا ایہا الکافرون فانہا براءۃ من الشرک، حضرت کھول سے روایت ہے، من قرء سورۃ ال عمران یوم الجمعة صلت علیہ الملائکۃ (مشکوٰۃ ص ۱۸۹) غرض یہ ہے کہ حدیث پاک میں قرأ کو خارج صلوة میں قرأت کے معنی میں باء کے بغیر، اور نماز میں باء کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

اس کی وجہ حضرت علامہ کشمیریؒ نے یہ بیان فرمائی کہ لغت عربی میں قرء فعل متعدی ہے جیسے کہ قرء الكتاب، شے مقررہ پر بے ضرورت نہیں، شریعت میں خارج صلوة میں قرء کا استعمال اسی وضع لغوی کے مطابق ہے، لیکن نماز میں قرأت آیہ رکن ہے اور

(۳) رواۃ حدیث کا سمجھا ہوا مطلب

حضرت عبادہ کی روایت پر مختلف زاویوں سے بحث کے نتیجے میں یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس روایت کا مقتدی سے کوئی تعلق نہیں اور یہ کہ اس سے مقتدی پر فاتحہ کا وجوب ثابت نہیں ہوتا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ روایت کرنے والے بیشتر راوی حدیث کہ خود حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ بھی وجوب کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔

یہ روایت دراصل زہری عن محمود بن الربیع عن عبادہ کی سند سے آرہی ہے، زہری کے بعد اس کی سند میں متعدد ہو گئی ہیں، امام بخاری، امام مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ میں زہری سے نقل کرنے والے سفیان بن عیینہ ہیں، اس لیے وجوب فاتحہ اور قرأت خلف الامام کے سلسلے میں ان چاروں راویوں کے مسلک کو معلوم کرنے سے مسئلہ منقطع ہو جائے گا، کیونکہ محدثین کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ راوی الحدیث اعراف بموارد الحدیث من غیرہ اور محدثین اس اصول کے مطابق راوی کی بیان کردہ مراد کو مقدم قرار دیتے ہیں۔

سفیان بن عیینہ کا مسلک ابوداؤد میں مذکور ہے، ابوداؤد نے پہلے مذکورہ بالا سند سے لاصلوۃ لمن لم یقرء بفاتحة الكتاب فصاعداً کو ذکر کیا پھر فرمایا قال سفیان لمن یصلی وحده (ابوداؤد جلد ۱، ص ۱۱۹) حضرت عبادہ کی اس روایت کا تعلق منفرد کی نماز سے ہے، یعنی مقتدی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

سفیان بن عیینہ کے شیخ امام زہری ہیں، ان کا مسلک بھی اس سلسلے میں مشہور ہے کہ وہ جہری نماز میں امام کے پیچھے کسی طرح کی قرأت کے قائل نہیں، اور سری نماز میں بھی وجوب کے نہیں صرف استحباب کے قائل معلوم ہوتے ہیں، شرح منقح کے حوالہ سے عدم وجوب کے قائلین میں متعدد صحابہ و تابعین اور فقہاء و محدثین کے نام آچکے ہیں ان میں امام زہری بھی شامل ہیں، مزید وضاحت کے لیے تفسیر ابن جریر کی عبارت دیکھئے۔

ابن جریر اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

حدثنا المثنی ناسوید انا ابن المبارک عن یونس عن الزہری قال

لاقرؤن وراء الامام فيما يجهر به من القراءة تكفيهم قراءة الامام وان لم يسمع صوته ولكنهم يقرؤن فيما لم يجهر به سرأ في انفسهم ولا يصلح لاحد خلفه ان يقرء معه فيما يجهر به سرأ ولا علانية قال الله تعالى واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔

”زہری نے کہا کہ مقتدی، جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت نہیں کریں گے، امام کی قرأت کافی ہے، خواہ امام کی آواز مسوع نہ ہو، لیکن وہ سری نمازوں میں دل ہی دل میں سری قرأت کریں گے، اور کسی کے لیے امام کے پیچھے جہری نماز میں سرأ یا علانیہ قرأت کرنا درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا، واذا قرئ القرآن فاستمعوا۔ الآیہ“ امام زہری کے شیخ محمود بن الربیع ہیں، یہ حضرت عبادہ کے داماد تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر پانچ سال تھی، صغار صحابہ میں ان کا شمار ہے ان کا مسلک سمجھنے کے لیے پہلی کی اس روایت پر غور کیجئے۔

عن محمود بن الربیع قال سمعت عبادہ بن الصامت یقرء خلف الامام فقلت له تقرء خلف الامام فقال عبادہ لاصلوۃ الابقرء

(السنن الکبری، جلد ۲، ص ۱۶۸)

محمود بن الربیع سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبادہ کو سنا، وہ امام کے پیچھے قرأت کر رہے تھے، تو میں نے کہا، آپ امام کے پیچھے قرأت کر رہے ہیں؟ تو حضرت عبادہ نے فرمایا کہ قرأت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

محمود بن الربیع نے حضرت عبادہ کو قرأت خلف الامام کرتے دیکھا تو انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ یہ بات صحابہ کے درمیان رائج نہ تھی اور ان کا عمل بھی یہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے کا نہیں تھا، اسی لیے انھوں نے حضرت عبادہ سے عرض کر دیا کہ آپ یہ عمل کیوں کر رہے ہیں؟ حضرت عبادہ نے جواب دے دیا کہ میرا مسلک تو یہی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرتا ہوں نماز قرأت کے بغیر نہیں ہوتی۔ اس سے یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ محمود بن الربیع مقتدی کے لیے قرأت یا وجوب فاتحہ کے قائل نہیں تھے۔

اب آخر میں حضرت عبادہ کے مسلک کا ذکر باقی ہے، تو اسی روایت سے حضرت عبادہ

کا مسلک معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ اگرچہ قرأت خلف الامام کے قائل ہیں مگر ظاہر یہی ہے کہ وجوب کے قائل نہیں ہیں۔

غور کیجیے کہ حضرت عبادہؓ، امتیازی اوصاف کے حامل صحابہ کرام میں ہیں، حضرت معاویہؓ سے ایک مسئلہ میں اختلاف رائے پر ناراض ہوئے تو یہ کہہ کر مدینہ واپس آ گئے کہ تمہارے زیر امارت تو رہنے کی بھی گنجائش نہیں، پھر حضرت عمرؓ نے انھیں یہ کہہ کر واپس کیا کہ آپ کو وہاں جانا چاہیے البتہ آپ حضرت معاویہؓ کی امارت سے مستثنیٰ رہیں گے۔ یہ واقعہ ابن ماجہ میں ہے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ امیر معاویہؓ سے اختلاف رائے میں تو تصلب کا یہ مظاہرہ ہو، اور اپنے گھر کے فرد اور داماد حضرت محمود بن الربیع سے نماز جیسی اہم عبادت کے مسئلے میں اختلاف رائے ہو تو محض اپنی رائے کے اظہار پر اکتفاء کریں اور انھیں کوئی نصیحت نہ فرمائیں۔

حضرت عبادہؓ اگر وجوب فاتحہ کے قائل ہوتے تو مزاج کے تصلب، ورع و تقویٰ کے امتیازی وصف کی بنیاد پر ضروری تھا کہ وہ محمود بن الربیع کو تفصیل سے سمجھاتے کہ تم مجھ سے قرأت خلف الامام کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟ تم کیسے نماز پڑھتے ہو؟ اور اس کی ضرورت یوں اور بڑھ جاتی ہے کہ محمود ان کے قریبی عزیز اور شاگرد ہیں۔ اگر حضرت عبادہؓ جیسے خاندان کے بزرگ اپنے خوروں کو نماز کی صحت و فساد پر متنبہ نہ فرمائیں گے تو یہ کام کون کرے گا؟

اس لیے حضرت عبادہؓ کے بارے میں یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ وہ اگرچہ قرأت خلف الامام کے قائل ہیں اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ اس عمل کو پابندی سے کرتے بھی ہیں لیکن ظاہر یہی ہے کہ وہ وجوب کے قائل نہیں ہیں ورنہ اس مسئلے میں ان کا انداز یہ نہ ہوتا کہ وہ محض اپنی رائے بیان کر دیں اور اس کے خلاف نکیر نہ فرمائیں۔

روایت عبادہؓ پر مباحث کا خلاصہ

امام بخاری نے باب کے تحت تین روایات ذکر فرمائی تھیں جن میں مقتدی پر وجوب

فاتحہ کے لیے حضرت عبادہؓ کی روایت سے استدلال ممکن تھا، اس لیے اس روایت پر قدرے تفصیلی کلام کیا گیا اور مختصر روایت کو مفصل روایت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی، متابعت و شواہد کے ساتھ سمجھنے کی بھی کوشش کی، نصاب اہل کے اضافہ کے بعد مضمون سمجھنے کی کوشش کی، قواعد عربیت کے مطابق مضمون مستنبط کرنے کی کوشش کی اور ہر موضوع پر اٹھائے جانے والے اہم اشکالات کا جائزہ لیا، لیکن ہر اعتبار سے یہی بات محقق ہوئی کہ روایت کو مقتدی کے لیے وجوب فاتحہ سے متعلق قرار دینا صحیح نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ روایت کرنے والے راوی بھی اس کے عموم میں مقتدی کو شامل نہیں سمجھتے۔

اور یہ کہ اب تک جو گفتگو کی گئی وہ سب حضرت عبادہؓ کی روایت کے اندر پائے جانے والے مضامین اور اس کے داخلی قرآن سے متعلق تھی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند خارجی لائل و قرآن کو سامنے رکھ کر بھی غور کر لیا جائے کہ حضرت عبادہؓ کی روایت کے عموم میں مقتدی کو شامل کیا جاسکتا ہے، یا نہیں؟

(۴) مقتدی کی قرأت اور قرآن کریم

ان خارجی دلائل میں ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ اہمیت قرآن کریم کو حاصل ہے، حضرت معاذؓ کی وہ روایت یاد کیجیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انھیں یمن بھیجا تو فرمایا، معاذ! کوئی بات پیش آگئی تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ حضرت معاذؓ نے جواب میں عرض کیا کہ کتاب اللہ کے ذریعہ فیصلہ کروں گا، آپ نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں نہ ملا تو کیا کرو گے؟ عرض کیا کہ سنت رسول اللہ کے ذریعہ فیصلہ کروں گا، آپ نے فرمایا، اس میں نہ ملا تو کیا کرو گے؟ عرض کیا، اجتہد بالسلی ولا آلو، اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اور کوئی کوتاہی نہ کروں گا، آپ نے حضرت معاذؓ کے جواب کی تحسین فرمائی، اسی اصول کے مطابق خارجی دلائل میں سب سے پہلے قرآن کریم کو دیکھنا چاہیے، باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا۔ (سورۃ الاعراف آیت ۲۰۴)

اور جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنا کرو، اور خاموش رہا کرو۔

یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور خواہ لیذہ المعراج میں نماز کی فرضیت سے پہلے

(۱) نماز کی روح ہی قرأت قرآن ہے اور نماز میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اس لیے خارج میں قرأت قرآن کا ادب استماع و انصات ہے تو داخل صلوٰۃ میں اس کو بدرجہ اولیٰ ثابت مانا جائے گا۔

(۲) نیز یہ کہ نماز باجماعت میں موضوع امامت کا تقاضہ بھی یہی ہے، پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے انما جعل الامام لئلا یؤتم بہ امام کو امام ہی اقتداء کرنے کے لیے بنایا گیا ہے، اس لیے سامع کے مقتدی ہونے کی صورت میں استماع و انصات کی اہمیت بڑھ جائے گی۔

(۳) اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ صحیح اور حسن کے درجے کی متعدد روایتوں سے یہ مضمون ثابت ہے جیسے اذا قرء فانصتوا، اور جیسے من كان له الامام فقرأه الامام قراءة له ان روایات پر گفتگو تو اپنی جگہ پر آئے گی، یہاں صرف یہ ثابت کرنا پیش نظر ہے کہ داخل صلوٰۃ میں قرأت قرآن کے وقت استماع و انصات بدرجہ اولیٰ ثابت ہے۔ ابن تیمیہؒ نے بھی اس کو درجہ اولیٰ میں ثابت قرار دیا ہے، فرماتے ہیں۔ لان استماع المستمع الى قراءة الامام الذي ياتم به ويجب عليه متابعتة اولی من استماعه الى قراءة من يقرأ خارج الصلوة (نذی جلد ۲۳ ص ۲۷۰)

حاصل گفتگو یہ ہے کہ آیت اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کا شان نزول ہی قرأت خلف الامام ہے اور اگر شان نزول سے صرف نظر کر لیں تب بھی اسی آیت سے دلالت النص کے طور پر مقتدی کے لیے قرأت کی ممانعت ثابت ہے۔

مقتدی کے لیے قرأت ممکن بھی نہیں

قرآن کریم کی آیت سے یہ ثابت ہو گیا کہ امام جب قرأت کرے تو مقتدی کا استماع و انصات اختیار کرنا ضروری ہے، جہری نمازوں میں تو بات صاف ہے لیکن سری نمازوں میں سب مقتدی جانتے ہیں کہ امام، ثناء کے لیے مختصر سا وقفہ کر کے قرآن پڑھتا ہے، مقتدی کو یقین ہے کہ قرآن پڑھا جا رہا ہے، پھر اس کے لیے کیا گنجائش ہے کہ انصات کو چھوڑ کر عمل قرأت کو جاری رکھے، بلکہ سچ پوچھے تو اس آیت کی روشنی میں مقتدی کے لیے نماز میں مذاقہ خود قرأت کا عمل کرنے کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں، حافظ ابو عمرو بن

اس کا نزول ہو یا بعد میں، اور خواہ حضرت عبادہؓ کی روایت اس سے پہلے کی ہو یا بعد کی، لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس آیت کا شان نزول نماز ہی ہے، مشہور صحابہ کرام میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ یہی فرماتے ہیں، تابعین میں مجاہد، حسن بصری، سعید بن المسیب وغیرہ سے یہی منقول ہے کہ اس آیت کا شان نزول نماز ہے اور امام احمد نے تو اس بات پر تمام اہل علم کا اتفاق اور اجماع نقل کیا ہے۔ نیز جمہور مفسرین اس آیت کا شان نزول نماز کو قرار دے رہے ہیں۔

گویا آیت قرآن کا موضوع ہی قرأت خلف الامام ہے اور اس میں صاف طور پر حکم دیا جا رہا ہے کہ جب امام قرأت کرے تو مقتدی پر استماع اور انصات لازم ہے، ”استماع“ کے معنی ہیں کان جھکا دینا جس کا حاصل توجہ ہے، مطلب یہ ہے کہ جب امام قرأت کرے تو آواز آئے یا نہ آئے تھیں ہم تن گوش بن جانا چاہیے، اور ”انصات“ کے معنی ہیں پوری توجہ کر کے خاموشی اختیار کر لینا، سکوت کرنا اور ظاہر ہے کہ سکوت کلام کی ضد ہے، مطلب یہ ہوا کہ نماز جہری ہو یا سری امام کی قرأت کے وقت مقتدی کے لیے اپنی زبان کو حرکت دینا جائز نہیں۔

یابات کو اس طرح سمجھ لیجیے کہ اذا قرئ القرآن جہری اور سری دونوں طرح کی نمازوں کو شامل ہے، اور اس پر مرتب کر کے دو حکم۔ استماع اور انصات، بیان کئے گئے ہیں، اس لیے مطلب یہ ہوگا کہ امام جہر کرے تو یہ استماع کا موقع ہے استماع واجب رہے گا اور اگر سری نماز ہو تو اذا قرئ القرآن کا عمل تو پایا جا رہا ہے اور استماع کی صورت ممکن نہیں ہے، اس لیے انصات واجب ہو جائے گا یعنی نماز سری ہو یا جہری، مقتدی کو قرأت کی اجازت نہیں ہے۔

اگر بالفرض شان نزول کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے بلکہ آیت کو نماز اور غیر نماز سب کے لیے عام رکھا جائے کہ جہاں بھی قرآن پڑھا جائے تو سننے والے کو ہم تن گوش اور خاموش ہو جانا چاہیے تو ہمیں اصول کے مطابق یہ فائدہ اٹھانے کا حق ہے کہ جب سامعین کو خارج صلوٰۃ میں استماع و انصات کا حکم دیا جا رہا ہے تو داخل صلوٰۃ میں استماع و انصات بدرجہ اولیٰ ضروری ہوگا، کیونکہ خارج صلوٰۃ میں سننے والے کے استماع و انصات میں صرف ایک ہی چیز ملحوظ ہے یعنی قرأت قرآن، جبکہ داخل صلوٰۃ میں ایک سے زائد چیزیں

یا آتی جاتی ہیں۔ مثلاً

اور تیسری چیز یہ ہے کہ اگر امام، مقتدیوں کی رعایت سے رک کر کھڑا ہو جاتا ہے تو گویا امام مقتدیوں کے تابع ہوا اور یہ منصب امامت کے منافی ہے۔

اب ایک ہی صورت باقی رہی کہ مقتدی امام کے ساتھ ساتھ پڑھے، اس صورت میں دو بڑی اہم خرابیاں ہیں ایک خرابی یہ کہ اس میں امام سے منازعت پائی جاتی ہے، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عبداللہ بن مالک ابن نجفہ کی روایت میں پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد مالی انما زع القرآن موجود ہے، اور دوسری خرابی یہ ہے کہ اس صورت میں فاسممعوا لہ وانصتوا کی خلاف ورزی ہے منازعت یہ نص حدیث ممنوع ہے اور استماع کی خلاف ورزی یہ نص قرآن ممنوع ہے، پھر ساتھ پڑھنے کی کیسے اجازت دی جائے؟

خلاصہ یہ ہوا کہ مقتدی کی قرأت کے لیے تین ہی صورتیں ممکن تھیں اور تینوں ہی میں قوی اشکالات ہیں اس لیے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ نماز جبری ہو یا ساری، امام کے پیچھے قرأت کا عمل قرآن کریم کی اس آیت کی رو سے درست نہیں قرار دیا جاسکتا۔

مکحول کے فیصلے پر حیرت

اس لیے اجازت دینے والے اکثر اہل علم نے مندرجہ بالا اشکالات کا وزن محسوس کرتے ہوئے بچے کی کوشش کی ہے، مثلاً کسی نے سکات کے درمیان قرأت کی اجازت دی، کسی نے سورہ فاتحہ کے بعد واسلے سکات میں اجازت دی، یہ الگ بات ہے کہ اس سے مسئلہ حل نہیں ہوا کہ ان سکات میں ازروئے احادیث اتنی گنجائش نہیں ہے، لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز بات حضرت مکحول نے کہی ہے ابوداؤد میں ہے۔ قال مکحول اقرء فیما جہر بہ الامام اذا قرء بفاتحة الكتاب ومکت مسراً فان لم یسکت اقرء بها قبله ومعه وبعده لاتترکھا علی حال، پہلے تو یہ فرمایا کہ امام سورہ فاتحہ کے بعد سکتہ کرے تو فاتحہ سر اڑھی جائے، پھر فرمایا کہ اگر امام سکتہ نہ کرے تو امام سے پہلے یا امام کے ساتھ یا امام کے بعد بہر صورت پڑھی جائے، حیرت کے سوا اب ہم اس پر کیا عرض کریں، ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے حکم استماع و انصات کے بعد اپنے مسلک کی پیروی کرتے ہوئے اس طرح کے توسعات پر تبصرے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ بس یہی کہا

عبدالبر نے التسمیہ میں یہ سوال قائم کیا ہے اور ابن تیمیہ نے بھی اسی طرح کی بات لکھی ہے کہ مقتدی پر قرأت کے وجوب کا حکم لگانے والوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کب قرأت کرے؟ اس لیے کہ اس کی تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، امام سے پہلے، یا امام کے ساتھ ساتھ یا پھر امام کے بعد، اور ان تینوں صورتوں میں قوی اشکالات ہیں۔

امام سے پہلے مقتدی کی قرأت کی صورت میں، سب سے پہلا اشکال تو یہ ہے کہ مقتدی کا عمل امام سے مقدم ہو گیا اس کی گنجائش نہیں، دوسرا اشکال یہ ہے کہ تکبیر تحریر کے بعد جو وقفہ ہے وہ ثا کے لیے ہے، قرأت کے لیے نہیں، اگر اس سکتہ میں قرأت کا عمل شروع ہوتا تو صحابہ کرام اس کو ضرور نقل کرتے، ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

وابيضاً فلو كان الصحابة كلهم يقرؤون الفاتحة خلفه اما في السكنة الاولى واما في الثانية لكان هذا مما تتوهمه الهمم والدواعي على نقله۔ (فتاویٰ جلد ۲۳، ص ۲۴۹)

نیز یہ کہ اگر صحابہ کرام سکتہ اولیٰ یا سکتہ ثانیہ میں امام کے پیچھے فاتحہ کی قرأت کرتے تھے تو اس کی نقل کا بہت اہتمام ہونا چاہیے تھا، اس کی نقل کے دواعی بھی بہت تھے۔

پھر اس کے بعد لکھتے ہیں فکیف و لم یسئل هذا احد عن احد من الصحابة کہ یہ بات کوئی بھی، کسی بھی صحابی سے نقل نہیں کرتا، پھر کچھ تفصیل کے بعد لکھتے ہیں فعلم انه بدعة کہ اس سے معلوم ہوا کہ سکتہ میں قرأت خلف الامام کا عمل بدعت ہے۔

تیسرا اشکال یہ ہے کہ پہلا سکتہ اگر مقتدی کی قرأت کے لیے ہوتا تو اس کو واجب ہونا چاہیے تھا، جبکہ وجوب کا کوئی قائل نہیں اور مالکیہ کے یہاں تو سکتہ ہی نہیں، ان کے یہاں تکبیر تحریر کے بعد فوراً قرأت شروع ہو جاتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام تکبیر کے فوراً بعد قرأت شروع کر دے اور سکتہ نہ کرے تو نماز درست ہے یا نہیں؟

اسی طرح مقتدی اگر امام کے بعد فاتحہ پڑھتا ہے تو وہ بھی اشکال سے خالی نہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کی قرأت کے بعد جو سکتہ ہے وہ بہت مختصر ہے اور آمین کے لیے ہے سورہ فاتحہ کی قرأت کی اس میں گنجائش نہیں، اور دوسری بات جیسا کہ ابن تیمیہ نے لکھا یہ ہے کہ اس کو دواعی کے باوجود کوئی صحابی نقل نہیں کر رہا ہے، پھر کیسے اس کو تسلیم کر لیا جائے،

آپ پوری توجہ مبذول کریں اور خاموش رہیں۔

اس روایت سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ زبان کو سرحرکت دینا یا ہونٹوں کو جنبش میں لانا بھی استماع و انصات کے منافی ہے اور جب حقیقت یہ ہے تو ابن حجر کو غور کرنا چاہیے تھا کہ اسکا تک بین التکبیر والقراءۃ میں اسکا کو ترک جہر کے معنی میں لینا درست نہیں بلکہ یہ سکوت عن الکلام السابق یا وقفہ کے معنی میں ہے، حضرت علامہ کشمیریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہاں یسید السکوت عما قبلہ وهو التکبیر۔ مراد یہ ہے کہ کلام سابق کے ختم کرنے کو سکوت سے تعبیر کر دیا گیا ہے کہ تکبیر کے بعد جو آپ وقفہ کرتے ہیں اس میں کیا پڑھتے ہیں، یعنی اسکا سے مراد ترک جہر نہیں بلکہ وقفہ ہے، علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اہل عرب، سکوت کو اس معنی میں استعمال کرتے ہیں جیسے قال فلان کذا وسکت علیہ، اے عن ردہ، پھر فرماتے ہیں کہ ابن حجر کی مستدل روایت کے بعض طرق میں اس معنی میں استعمال کی صراحت ہے، امام بخاری نے جزء القراءۃ میں باب من قرء فی سکنات الامام میں یہ الفاظ ذکر کئے ہیں، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یسکت اسکاۃ عن تکبیرۃ الخ کیا اس سے یہ بات بالکل صاف نہیں ہوتی کہ یہاں لفظ اسکاۃ، تکبیر کے بعد وقفہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ ابن حجر جس روایت سے استدلال کر رہے ہیں اس میں لفظ اسکاۃ ہے اور اس موضوع پر نص قرآن یا نص حدیث میں لفظ انصات استعمال ہوا ہے اور ان دونوں الفاظ میں فرق ہے، اسکاۃ کے معنی ہیں خاموشی بمعنی ترک تکلم، اور انصات کے معنی ہیں اسکاۃ سکوت مستمع، پوری توجہ مبذول کرنے والے کی طرح سکوت اختیار کرنا، یعنی آواز آ رہی ہے تو ہم تن گوش ہو جاؤ اور آواز نہیں آ رہی ہے تو بغور سننے والوں کی طرح خاموش رہو، پھر جب از روئے لغت دونوں میں فرق ہے اور قرینہ مقام سے بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اسکاۃ بمعنی وقفہ ہے تو ابن حجر کے اس دعوے کو کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ انصات اور قرأت میں منافات نہیں ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ آیت قرآنی اذا قرأ القرآن فاستمعوا له وانصتوا اسی طرح نص حدیث اذا قرء فانصتوا میں انصات کا مقابلہ قرأت قرآن سے کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ قرأت قرآن کے وقت انصات اختیار کرو جبکہ ابن حجر کی مستدل

جائے گا کہ انھوں نے جو کچھ سمجھ میں آیا بیان فرمادیا!

حافظ ابن حجرؒ کے استدلال پر نقد

اسی طرح حافظ ابن حجر نے گنجائش نکالنے کی بھی کوشش کی ہے۔ باب مایقول بعد التکبیر کے تحت ایک روایت میں آیا تھا اسکاۃ تک بین التکبیر والقراءۃ ماتقول؟ ابو ہریرہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ جو تکبیر تحریرہ اور قرأت کے درمیان سکوت فرماتے ہیں تو آپ کیا دعا پڑھتے ہیں؟ حافظ ابن حجرؒ نے یہاں یہ فائدہ اٹھایا کہ سکوت، قرأت کے منافی نہیں ہے، یہ دونوں جمع ہو سکتے ہیں کیونکہ روایت میں اسکاۃ تک بھی آ رہا ہے اور ماتقول بھی، پھر ابواب الجمعہ میں انھوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ نماز تحیۃ المسجد پڑھنا بھی منافی انصات نہیں ہے، کہتے ہیں فمصلی التحیۃ یجوز ان یطلق علیہ انه منصت۔ (بخ جلد ۲، ص ۴۷۵) ابن حجر یہ چاہتے ہیں کہ اسکاۃ کو ترک جہر کے معنی میں لے کر سری قرأت کا انصات سے تضاد ختم کر دیں، اور قرأت خلف الامام کی گنجائش نکال لیں، اور ثابت کر دیں کہ مقتدی مصت کے ساتھ قاری بھی ہو سکتا ہے کہ آہستہ آہستہ پڑھتا رہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سکوت بھی فرما رہے ہیں اور قاری بھی ہیں۔

ابن حجر کی یہ بات بہ ظاہر درست معلوم ہوتی ہے، لیکن غور کیجیے کتاب الوحی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں گزر چکا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام جب وحی لے کر تشریف لاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہونٹوں کو حرکت میں لاتے، ترمذی شریف میں زیادہ واضح ہے بحسب کہ بہ لسانہ یرید ان یحفظہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو یاد کرنے کی وجہ سے زبان مبارک اور لب ہائے مبارک کو آہستہ آہستہ ہلاتے تھے یعنی سر اُپر ہتے جاتے تھے کہ قرآن یاد ہو جائے، بھول نہ جائیں، آپ کے اس سری قرأت فرمانے پر حکم نازل ہوا، لا تحسبک بہ لسانک الا یہ آپ زبان کو بالکل حرکت نہ دیں، قرآن کا آپ کے سینہ میں محفوظ کرنا اور آپ کی زبان سے پڑھوا دینا ہماری ذمہ داری ہے، بخاری شریف کی روایت میں اس موقع پر فاتبع قرائتہ کی تفسیر یہ ہے۔

فاستمع له وانصت (بخاری جلد ۱، ص ۴)

کے الفاظ یہ ہیں۔

اذا قرأ فانصتوا (مسلم جلد ۱، ص ۱۷۴)

جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں اس موقع پر پہلے ابو موسیٰ اشعریؓ کی ایک طویل حدیث ذکر فرمائی ہے۔ پھر اس کی متعدد سندیں ذکر کی ہیں اور حدثنا اسحق بن ابراہیم قال انا جریس عن سليمان التيمي عن قعادة عن يونس بن جبير عن حطان بن عبد الله عن ابي موسى الاشعريؓ کی سند ذکر کر کے فرمایا کہ اس میں اذا قرأ فانصتوا کا اضافہ ہے، اس اضافہ کو اگر اس حدیث طویل کے نماز سے متعلق حصہ کے ساتھ ملایا جائے تو روایت کے الفاظ اس طرح ہو جاتے ہیں۔

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم خطبنا فبين لنا سنتنا وعلما صلوتنا فقال اذا صليتم فاقموا صفوفكم ثم ليؤتمكم احدكم فاذا كبر فكبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا امين۔ (مسلم جلد ۱، ص ۱۷۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے خطبہ دیا اور ہمارے سامنے سنت کا بیان فرمایا اور ہمیں نماز کی تعلیم دی اور فرمایا کہ جب نماز کا ارادہ کرو تو پہلے اپنی صفیں درست کر لو پھر چاہیے کہ تم میں سے ایک امام بنے اور جب وہ تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

پھر اس کے بعد امام مسلم کے راوی ابو اسحاق کہتے ہیں کہ ابو بکر ابن اخت ابی النضر نے حضرت ابو موسیٰؓ کی اس اضافہ والی روایت کے بارے میں کچھ کہا تو قال مسلم تريد احفظ من سليمان؟ یعنی کیا تمہیں سلیمان سے اونچے حافظ حدیث کی تلاش ہے؟ مطلب یہ تھا کہ سلیمان حفظ و ضبط میں کمال رکھنے والے شیخ و محدث ہیں۔ اس لیے کسی کی مخالفت ان کے لیے مضر نہیں۔

اس کے بعد ابو بکر نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے بارے میں پوچھا تو امام مسلم

روایت اسکا تک بین التکبیر میں یہ تقابل نہیں ہے بلکہ تکبیر اور قرأت کے درمیان پائی جانے والی حالت پر اسکا تک کا لفظ بولا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ حالت وقف کی ہے، اس تفصیل سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حافظ ابن حجر کا یا کسی اور کا اسکا تک الخ سے سری قرأت کی گنجائش نکالنا درست نہیں ہو سکتا، اور قرآن کریم کے حکم انصات کی جہاں جبری قرأت سے منافات ہے، وہاں سری قرأت سے بھی ہے۔

بہر حال قرآن کریم کی آیت سے، یہ حکم صراحت و قوت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ مقتدی کا وظیفہ نماز میں قرأت نہیں، استماع و انصات ہے اور جب یہ بات ہے تو حضرت عبادہؓ کی روایت کے عموم میں مقتدی کو داخل کرنا درست نہیں۔

(۵) مقتدی کی قرأت اور احادیث

حضرت معاذؓ کی روایت کے مطابق غور طلب اور اختلافی مسائل میں فیصلہ کا دوسرا ذریعہ حدیث پاک ہے، اس لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ قرأت خلف الامام کے موضوع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا ارشاد فرمایا ہے تاکہ حضرت عبادہؓ کی روایت میں کہے جانے والے عموم کے دعوے کا وزن معلوم کیا جاسکے۔

اس سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ حدیث پاک کے پورے ذخیرے میں ایک بھی صحیح روایت ایسی نہیں ہے جس میں صراحت کے ساتھ مقتدی کو قرأت کا حکم دیا گیا ہو، جب کہ متعدد صحابہ کرام سے کثیر تعداد میں صحیح اور حسن سند کے ساتھ ایسی روایات موجود ہیں جن میں صراحت کے ساتھ مقتدی کو انصات کا حکم دیا گیا ہے یا امام کی قرأت کو مقتدی کے لیے کافی قرار دیا گیا ہے یا مقتدی کی قرأت پر اظہار ناگواری کے بعد صحابہ کرام کے قرأت ترک دینے کا ذکر ہے، وغیرہ، ان تمام روایات کے استیعاب کا تو یہاں موقع نہیں، مگر چند روایات پیش کی جاسکتی ہیں۔

مقتدی کے لیے حکم انصات پر مشتمل روایت

مثلاً ایک صحیح روایت میں صراحت کے ساتھ مقتدی کو انصات کا حکم دیا گیا ہے، جس

پایا جانا ظاہر نہ ہوا ہو۔

ما اجمعوا علیہ کی یہی تشریح بہتر معلوم ہوتی ہے کہ امام مسلم یقیناً محدثین کی مقرر کردہ اجماعی شرائط صحت سے واقف ہیں اور وہ ان شرائط کو جن روایات میں محقق پاتے ہیں ان ہی کو اپنی صحیح میں جگہ دیتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ بعض محدثین کی نظر میں، بعض روایات میں ان شرائط کا تحقق ظاہر نہ ہوا ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعرئ کی روایت، امام مسلم کی نظر میں محدثین کی مقرر کردہ اجماعی شرائط صحت کی حامل ہے، اسی لیے انھوں نے اس روایت کو اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے، البتہ حضرت ابو ہریرہ کی روایت کو انھوں نے صحیح میں اس طرح نہیں لیا اور اس لیے اس کی تصحیح کے وقت انھوں نے ہو عندی صحیح فرمایا کہ وہ روایت میرے نزدیک صحیح ہے گویا وہ اس روایت میں محدثین کی اجماعی شرائط صحت کے تحقق کی ذمہ داری نہیں لے رہے ہیں۔

دوسری کتابوں میں ان روایات کی تخریج

صحیح مسلم کے علاوہ یہ دونوں روایات حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی آئی ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ کی روایت ابو داؤد نے بساب التمشید میں ذکر کی ہے مگر اس پر یہ تبصرہ کیا ہے، قال ابو داؤد قوله وانصتوا لیس بمحفوظ لم یحجی بہ الاسلیمان التیمی فی هذا الحدیث، انصتوا کا اضافہ محفوظ نہیں ہے، اس روایت میں سلیمان تمیمی کے علاوہ اور کسی راوی نے اس کو ذکر نہیں کیا ہے۔

نیز یہ روایت ابن ماجہ میں بھی بہ الفاظ اذا قرء الامام فانصتوا مذکور ہے، مسند احمد میں بھی ہے صحیح ابوعوانہ میں متعدد صحیح سندوں کے ساتھ ذکر کی گئی، مسند بزار اور بیہقی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں موجود ہے۔

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ کی روایت بھی، مسلم شریف کے علاوہ، ابو داؤد میں بساب الامام یصلی من قعود میں مذکور ہے مگر اس پر بھی امام ابو داؤد نے یہ تبصرہ کیا ہے قال ابو داؤد وهذه الزیادة واذا قرأ فانصتوا لیست بمحفوظة الوهم عندنا من اسی خالد۔ نیز یہ روایت نسائی شریف اور ابن ماجہ میں بھی ہے، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند

نے فرمایا کہ میرے نزدیک وہ صحیح ہے، اس پر ابو بکر نے یہ پوچھا کہ پھر آپ نے اس کو کتاب میں کیوں ذکر نہیں کیا؟ تو امام مسلم نے جواب دیا۔ لیس کل شئی عندی صحیح وضعتہ ہنہنا انما وضعت ہنہنا ما اجمعوا علیہ میرے نزدیک جتنی احادیث صحیح ہیں ان سب کو میں نے اس کتاب میں نہیں لیا ہے، صرف ان روایات کو لیا ہے جن کی صحت پر محدثین حضرات کا اجماع ہے۔

گویا امام مسلم کے پیش نظر یہاں اذا قرأ فانصتوا کے اضافہ والی دو روایتیں ہیں، ایک روایت حضرت ابو موسیٰ اشعرئ کی ہے جسے اہمیت کے ساتھ انھوں نے متن کتاب میں لیا ہے اور اس پر کئے گئے اشکال کا جواب اسرید حفظ من سلیمان (کہہ کر دیا ہے اور یہ روایت امام مسلم کے نزدیک ما اجمعوا علیہ کا مصداق ہے اور دوسری روایت حضرت ابو ہریرہ کی ہے جسے انھوں نے صحیح میں نہیں لیا تھا لیکن ابو بکر بن اخت ابی النضر کے جواب میں انھوں نے اس روایت کو بھی اپنے نزدیک صحیح قرار دیا اور اس طرح یہ روایت بھی امام مسلم کی خصوصی تصحیح کے ساتھ کتاب مسلم میں اشارہ ذکر میں آگئی۔

امام مسلم کے ما اجمعوا کا مطلب

امام مسلم کے نزدیک ما اجمعوا کے کیا معنی ہیں؟ تو بعض اکابر نے تو یہ لکھا ہے کہ اس سے چند ائمہ محدثین مراد ہوتے ہیں، جن میں امام احمد، یحییٰ بن معین، عثمان بن ابی شیبہ اور سعید بن منصور خراسانی شامل ہیں، لیکن مقدمہ ابن الصلاح میں اس کے معانی کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

قلت اراد۔ واللہ اعلم، انه لم یضع فی کتابہ الا الاحادیث الثی وجد عنده فیہا شرائط الصحیح المجمع علیہ وان لم یظهر اجتماعہا فی بعضها عند بعضهم (مقدمہ ابن الصلاح ص ۸)

میں کہتا ہوں کہ ما اجمعوا کی مراد۔ واللہ اعلم یہ ہے کہ امام مسلم نے اپنی کتاب میں صرف ان احادیث کو جگہ دی ہے جن میں ان کے نزدیک محدثین کی مقرر کردہ حدیث صحیح کی اجماعی شرائط پائی جاتی ہیں خواہ ان تمام شرائط کا بعض روایات میں بعض محدثین کے نزدیک

اس لیے بالفرض اگر یہ حضرات متفرد بھی ہوں تو اس سے روایت کو ناقابل قبول قرار دینا اصول محمدین سے انحراف معلوم ہوتا ہے، بلکہ اصول کے مطابق روایت کا قبول کرنا ضروری ہے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ راوی کا تفرد اس وقت معسر ہوتا ہے جب اس کی روایت دیگر ثقہ راویوں سے متعارض ہو، یہاں تعارض محض ظاہر میں تو ہے کہ ایک راوی اذا قرا فانصتوا کا اضافہ کر رہا ہے اور دوسرے کے یہاں یہ الفاظ نہیں ہیں اور محمدین کے نقطہ نظر سے اس کی اہمیت بھی ہے کہ وہ الفاظ کے ظاہر پر جمود اختیار کر لیتے ہیں لیکن اگر باب تحقیق کے یہاں محض ظاہر پر فیصلہ نہیں کیا جاتا اور مضمون کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے، یہاں یہ صورت ہے کہ اگر بالفرض اذا قرا فانصتوا سے صرف نظر کر لیں تو تب بھی روایت کے سیاق و سباق سے یہی مضمون ثابت ہے۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جن روایات میں اذا قرا الامام فانصتوا کا اضافہ ہے ان میں امام کی اقتداء اور اتباع کی جزئیات بیان کی گئی ہیں کہ جب امام تکبیر تحریر منعقد کرے تو تم بھی تکبیر کہو، جب وہ رکوع میں جائے تم بھی رکوع میں چلے جاؤ، جب وہ سجدہ میں جائے تو تم بھی سجدہ میں جاؤ وغیرہ، اب دیکھنا یہ ہے کہ قرأت کے سلسلے میں امام کی اتباع کا کیا طریقہ بتایا گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ کسی روایت میں اذا قرا فاقراء و انھیں ہے بلکہ ان روایات میں اگر اذا قرا فانصتوا سے صرف نظر کر لیں تو یہ بات تو سب ہی روایات میں ہے اذا قال غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فقولوا امین، بالکل بدیہی بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر مقتدی کو قرأت کی اجازت ہوتی تو الفاظ اذا قلتم غیر المغضوب الخ پڑھو تو آمین کہا کرو بلکہ مسلم شریف کی ایک روایت میں تو اذا قال القاری غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فقال من خلفہ امین فرمایا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ قاری صرف امام ہی ہے مقتدی نہیں، اور یہ کہ شریعت نے مقتدی کو امام کے ساتھ قرأت میں شریک ہی نہیں کیا، شرکت ہوئی ہے تو صرف آمین میں ہوئی ہے، نیز یہ کہ اس موضوع پر قرآن کریم کی ہدایت بھی یہی ہے اذا قرأ القرآن فاستمعوا

احمد اور دارقطنی وغیرہ میں بھی ہے، اور ان روایات میں سلیمان تیمی، اور ابو خالد الاحمر پر تفرد کے اشکال کا بھی جواب ہے۔

اعتراض اور جوابات

ان روایات پر محمدین کی جانب سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ مطولات میں موجود ہیں ان میں امام ابو داؤد کے تبصرے کو اہمیت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت کے بارے میں انھوں نے کہا کہ انصتوا کا اضافہ محفوظ نہیں کیونکہ یہ سلیمان تیمی کا تفرد ہے، اسی طرح کی بات امام بخاری نے جزء القراءة میں اور دارقطنی و بیہقی وغیرہ نے بھی کہی ہے۔

اسی طرح کا اعتراض حضرت ابو ہریرہ کی روایت پر بھی ہے کہ اس میں ابو خالد الاحمر متفرد ہیں بیہقی نے تو کتاب المعرفة میں یہ لکھ دیا کہ حفاظ حدیث ابو داؤد، ابو حاتم، حاکم اور دارقطنی نے اس اضافے کو نادرست قرار دیا ہے، وغیرہ۔ لیکن ان اعتراضات کی اصولی محمدین کے مطابق کوئی اہمیت نہیں، وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ پہلی روایت میں سلیمان تیمی اور اسی طرح دوسری روایت میں ابو خالد الاحمر ضعیف رواۃ میں نہیں ہیں کہ تفرد کو معسر قرار دیا جائے، بلکہ نہایت ثقہ محمدین ہیں، سلیمان تیمی کے بارے میں امام مسلم نے التریبہ حفظ من سلیمان فرمایا ہے، احمد جرح و تنقید نے ان کی توثیق کرتے ہوئے اونچے الفاظ استعمال کئے ہیں، امام احمد، امام نسائی، ابن معین اور عجلی نے ان کو ثقہ کہا ہے، ابن حبان نے فرمایا ہے کہ وہ ثقہ، متقن، حافظ صاحب سنت اور بصرہ کے عابدوں میں تھے، ذہبی نے ان کو الحافظ، الامام اور شیخ الاسلام وغیرہ لکھا ہے۔

اسی طرح ابو خالد الاحمر کے بارے میں بڑے وقیع کلمات منقول ہیں، کعب، ابن معین اور ابن مدینی ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابو حاتم نے ان کو صدوق کہا ہے، عجلی نے ان کو ثقہ، مثبت کہا ہے، ابن ہشام رقائی نے ان کو ثقہ امین کہا ہے۔ وغیرہ۔ ان کے بارے میں مطولات میں اس سے زیادہ کلمات توثیق ذکر کئے گئے ہیں۔

تو ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! میں نے مسیح اسم ربک الاعلیٰ پڑھی، تو آپ نے ارشاد فرمایا مالی انازع القرآن، اما یکفی قراءۃ امامہ؟ انما جعل الامام لیوتم بہ فاذا قرء فانصتوا۔ (کتاب القراءۃ ص ۹۳)

امام بیہقی نے حضرت انسؓ اور حضرت عمرؓ کی روایات کو شاہد کے طور پر ذکر نہیں کیا ہے بلکہ نقل کرنے کے بعد ان پر جرح کی ہے مگر ہم بیہقی کے ممنون ہیں کہ اس طرح انھوں نے اذقرا فانصتوا کے بارے میں ایسی دو روایتیں ذکر فرمادیں جنھیں شاہد کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

صحیح روایت، اتنے متابعات اور شاہد کے بعد یقیناً شک و شبہ سے بالاتر ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض محدثین، اصولی محدثین سے ہٹ کر اپنے فقہی مسلک کے زیر اثر فیصلہ کریں، یا ان محدثین کے بارے میں حسن ظن کی بنیاد پر۔ جیسا کہ ابن الصلاح نے کہا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید ان پر شرائط صحت کا انکشاف نہ ہوا ہو، لیکن صورت حال کی تشخیص اور شرائط صحت کے ظہور و انکشاف کے بعد تو صداقت کو قبول کر لینا چاہیے، والحق احسن ان يتبع۔ علامہ سندھی نے تو اس موقع پر ایک فیصلہ کن بات ان الفاظ میں ارشاد فرمائی ہے۔ هذا الحديث صحيحه مسلم فلا عبرة بتضعيف من ضعفه کہ امام مسلم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، اس لیے تضعیف کرنے والوں کی تضعیف کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

تصحیح اور تضعیف کرنے والوں کے چند نام

تاہم جن لوگوں پر شرائط صحت منکشف نہ ہو سکیں اور انھوں نے اس روایت کی صحت کو تسلیم نہیں کیا، ان میں امام بخاری، امام ابو داؤد، دارقطنی، ذہبی اور ابویعلیٰ نیشاپوری وغیرہ کے نام شمار کئے جاتے ہیں، شاید یہ حضرات بعض رواۃ کے تفرّد اور چند معمولی اشکالات کی بنیاد پر یہ فیصلہ کر گئے۔

اور جن لوگوں نے شرائط صحت کے تحقق کی بنیاد پر روایت کو صحیح قرار دیا، ان میں امام احمد بن حنبل، امام مسلم، امام نسائی، امام ابوزر عہ رازی، ابوعوانہ، امام منذری، علامہ ابن حزم، امام ابوعمر بن عبد البر اسحاق بن راہویہ، موفق الدین بن قدامہ، ابن تیمیہ، اور خاتم الحفاظ

وانصتوا، جس کی تفصیل گزر چکی ہے کہ نزول وحی کے وقت ہونٹوں کو حرکت دینا بھی استماع وانصات کے منافی قرار دیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر روایت میں اذقرا فانصتوا نہ بھی ہو تب بھی سیاق و سباق سے بھی مضمون معین ہوتا ہے کہ قرأت کے بارے میں مقتدی کے اتباع کا طریقہ انصات ہے قرأت نہیں، اس لیے اضافہ کو تفرّد مضر قرار دے کر رد کرنا کسی بھی حال میں درست نہیں ہے۔

(۳) تیسری بات ہے کہ تفرّد کا اعتراض ہی خلاف واقعہ ہے جن حضرات نے تفرّد کا الزام عائد کیا ہے ہمارا حسن ظن تو یہی ہے کہ ان کے علم میں ایسا ہی ہوگا، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، نہ سلیمان حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت میں متفرّد ہیں اور نہ ابو خالد الاحمر حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں۔ کیونکہ صحیح ابوعوانہ میں ابوعبیدہ نے اور دارقطنی میں عمر بن عامر اور سعید بن ابی عروبہ نے قراءہ سے اذقرا فانصتوا کی روایت میں سلیمان جمعی کی متابعت کی ہے، اسی طرح ابو خالد الاحمر کی متابعت میں محمد بن سعد انصاری اشہلی کا نام نسائی کی روایت میں موجود ہے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ اصولی محدثین کے مطابق متابعت اور شاہد کی بہت اہمیت ہے، ضعیف روایت بھی بسا اوقات ان کے ذریعہ قوت حاصل کر لیتی ہے، پھر اگر صحیح روایت کو درجہ صحت ہی کی متابعت مل جائے تو اس کی صحت میں شک نہیں کیا جاسکتا۔ اذقرا فانصتوا کے بارے میں صورت حال یہ ہے۔

(الف) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی صحیح روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں جس پر بحث ہو چکی ہے۔ (ب) پہلا شاہد حضرت ابو ہریرہؓ کی صحیح روایت ہے اس پر بحث گزر چکی ہے۔

(ج) دوسرا شاہد حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے جو بیہقی کی کتاب القراءۃ میں ثقہ راویوں کی سند سے مذکور ہے جس کے الفاظ یہ ہیں ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذقرا الامام فانصتوا (کتاب القراءۃ للبیہقی ص ۹۲)

(د) تیسرا شاہد حضرت عمر بن خطابؓ کی روایت ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی، کسی ایک شخص نے آپ کے پیچھے سری قرأت کی، نماز سے فارغ ہو کر آپ نے فرمایا کہ کسی نے میرے ساتھ قرأت کی؟ آپ نے یہ بات تین بار کہی

عباس رضی اللہ عنہم شامل ہیں ہم نے یہ روایت موطا امام محمد سے نقل کی ہے جس کی سند اس طرح ہے: أخبرنا ابو حنیفہ قال حدثنا ابو الحسن موسیٰ بن ابی عائشہ عن عبد اللہ بن شداد بن الہاد عن جابر بن عبد اللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سند کے تمام رجال ثقاہت کے اعلیٰ معیار کے حامل ہیں۔

پہلے راوی امام محمد ہیں جن کے علمی کارناموں کی ساری دنیا میں شہرت ہے، امام شافعی سے ان کے بارے میں یہ منقول ہے حملت عند محمد وقریبہ کتب میں نے امام محمد سے اونٹ کے بار کے بقدر کتابوں کا علم حاصل کیا ہے، یہ بھی فرمایا کہ وہ دلوں کو علم سے پر کر دیتے تھے۔ یہ بھی فرمایا اذ اتکلم محمد رحمہ اللہ فکانما ينزل الوحي، جب امام محمد علمی گفتگو کرتے تو ایسا معلوم ہونے لگتا کہ وحی کا نزول ہو رہا ہے، امام ذہبی نے فرمایا کہ وہ علم کا سمندر تھے ایک جگہ فرمایا کان من اذ کباء العالم امام احمد سے پوچھا گیا کہ یہ دقیق علمی مسائل آپ نے کہاں سے حاصل کئے؟ تو فرمایا کہ امام محمد کی کتابوں سے، دارقطنی نے فرمایا کہ موطا میں رکوع کے وقت رفع یدین مذکور نہیں لیکن امام مالک سے جس ”ثقات حفاظ“ نے رفع یدین غیر موطا میں نقل کیا ہے اور ان میں امام محمد اور یحییٰ بن سعید نقطان وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرے راوی امام اعظم ہیں جن کی علمی جلالت، ورع و تقویٰ، حفظ و اتقان اور ذکاوت و فطانت پر شرق و غرب کا اتفاق ہے، علمی فقہی و اخلاقی کمالات کا اعتراف اپنی جگہ، البتہ محدثین کے معیار مطلوب کے مطابق سینکڑوں میں سے چند اقوال یہ ہیں، قال شعبۃ کان واللہ حسن الفہم جید الحفظ (شعبۃ کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ فہم میں بہتر اور حفظ میں عمدہ تھے، شعبۃ بن جاج (المتوفی ۱۶۰ھ) امام اعظم کے ہم عصر ہیں، رجال کے سلسلے میں ان کی احتیاط تشدد کی حد تک معروف ہے، انھوں نے قسم کھا کر امام اعظم کے جوہر حفظ کی شہادت دی، یہ امام اعظم پر ضعف حفظ کا الزام عائد کرنے والوں کے لیے عبرت کی چیز ہے، امام اعظم کے بارے میں تقریباً تو اترے منقول ہے کہ وہ دور کعتوں میں قرآن کریم ختم کرتے تھے، کیا ایسے لوگوں کو ضعیف الحفظ کہا جاسکتا ہے؟ امام علی بن مدینی جن کا تشدد مشہور ہے اور جو امام بخاری کے اجلہ شیوخ میں ہیں، جن کے بارے میں امام

حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ ہیں، اور ان میں اکثر مالکی، شافعی اور حنبلی ہیں اور تلاش کرنے سے شاید اور بھی نام مل سکتے ہیں، پھر ان کے ساتھ جمہیر حنفیہ کو بھی شامل کیا جائے تو پھر تصحیح کرنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہو جائے گی۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ اذا قرأ فانصتوا کی روایت بالیقین صحیح ہے اور مقتدی کے بارے میں ہے، جس میں صراحت کے ساتھ یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ امام کی قرأت کے وقت مقتدی کو انصات کا عمل اختیار کرنا چاہیے، پھر اس تصریح کے بعد کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت عبادہ کی روایت میں لمن لم یقرء کے موم میں مقتدی بھی داخل ہے؟

امام کی قرأت کو مقتدی کی قرأت بتانے والی روایت

اس سلسلے کی دوسری روایت جس میں صراحت کے ساتھ مقتدی کو قرأت سے روک دیا گیا ہے، اور امام کی قرأت کو مقتدی کی قرأت بتایا گیا ہے، حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری اور دیگر متعدد صحابہ سے کتابوں میں آ رہی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

من كان له امام فان قراءته له قراءة (موطا امام محمد ص ۹۸)

نماز میں جس کا کوئی امام ہو تو امام کی قرأت اس کی قرأت ہے۔

اس روایت میں جو ارشاد فرمایا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ مقتدی کی نماز کو قرأت سے خالی سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ مقتدی کی جانب سے یہ بار امام نے اٹھا رکھا ہے اور مقتدی کو امام کی قرأت کی وجہ سے قاری تسلیم کیا گیا ہے، شریعت میں اس کی نظیریں ہیں کہ ایک چیز متعلق کسی شخص سے ہوتی ہے اور اس کا عمل دوسرے سے کرایا جاتا ہے، جیسے صدقۃ الفطر ہے کہ غلام پر بھی واجب ہے اور چھوٹے بچوں پر بھی لیکن اس وجوب کی ادائیگی خود ان کے متعلق نہیں ہے بلکہ غلام کی طرف سے مولیٰ اور بچوں کی طرف سے باپ کو ادا کرنے کا مکلف کیا گیا ہے۔

روایت کس درجہ کی ہے

یہ روایت صحابہ کرام کی ایک جماعت سے منقول ہے جن میں حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن

دینے کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ یہ "بازی بازی بارئش بابا ہم ہی بازی" کا مصداق ہے تاہم کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے۔ جیسا کہ چند ائمہ کے اقوال پیش کئے جا چکے ہیں اور اس سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ محدثین کرام کی جرح و تعدیل اور اس کے رد و قبول کے بھی اصول ہیں، ورنہ ہر شخص کی، ہر انسان کے بارے میں جرح کو قبول کیا جائے تو پھر کوئی بڑے سے بڑا محدث بھی نہیں بچے گا، اسی باب میں آپ نے دیکھا کہ کہنے والے نے حضرت سعد بن ابی وقاص تک کے بارے میں یہ کہہ ڈالا کہ وہ نماز پڑھانا بھی نہیں جانتے، تاج الدین سبکی (المتوفی ۷۷۷ھ) نے لکھا ہے لو اطلقنا تقدیم الجرح لماسلم لنا احد من الائمة، اذما من امام الا وقد طعن فيه طاعنون وهلك فيه هالكون، اگر ہم جرح کو ہر حال میں مقدم کر دیں تو ائمہ میں سے کوئی محفوظ نہیں رہے گا، اس لیے کہ ہر امام کے بارے میں طعن کرنے والوں نے طعن کیا ہے، اور ہلاک ہونے والے یہ کام کر کے ہلاک ہو چکے ہیں۔

نیز یہ کہ ائمہ کبار کے بارے میں کسی نے کلام کیا ہے تو اس پر نکیر بھی کی گئی ہے، محمد بن عمرو عقیلی (المتوفی ۳۲۲ھ) نے علی بن مدینی کو ضعفاء میں شمار کیا ہے تو حافظ ذہبی (۷۴۸ھ) نے میزان الاعتدال میں اس طرح لکھا افعالک عقل یا عقیلی؟ اتدري فيمن تتكلم وانما اشتبهى ان تعرفنى من هو الثقة الثبت الذى ما غلط ولا انفراد بما لا يتابع عليه. عقیلی! کیا تمہیں عقل نہیں ہے؟ جانتے ہو کس کے بارے میں کلام کر رہے ہو، میں آپ سے صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ایسا ثقہ اور ثبت کون ہے جس سے غلطی نہیں ہوئی؟ اور اس کی روایت میں ایسا انفرادی نہیں ہے جس کی متابعت نہیں ملتی؟ اسی طرح دارقطنی کے امام اعظم کو ضعیف کہنے پر علامہ غنی نے لکھا ہے ومن اين له تضعيف ابى حنيفة وهو مستحق التضعيف وقد روى مسنده احاديث مقبولة معلولة ومنكورة وموضوعة، دارقطنی کو امام ابو حنیفہ کی تضعیف کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا؟ وہ خود مستحق تضعیف ہیں، انھوں نے اپنی مسند میں کمزور، معلول، منکر اور موضوع احادیث نقل کی ہیں۔ اسی طرح مولانا عبدالحی علی بحر العلوم نے فوارح الموت میں لکھا ہے کہ تزکیہ کا کام کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خود عادل ہو، اسباب جرح و تعدیل

بخاری کہتے ہیں کہ میں نے ابن مدینی کے علاوہ کسی کے سامنے اپنے آپ کو بیچ نہیں سمجھا، وہ امام صاحب کے بارے میں کہتے ہیں، هو ثقة، لا باس به، اس زمانہ میں لا باس بہ، ثقہ کے ہم معنی استعمال ہوتا تھا اور یہی معنی علی بن مدینی کے یہاں بھی ہیں، اسی طرح ابن معین نے امام صاحب کے بارے میں فرمایا هو ثقة ماسمعت احدا ضعفه، وہ ثقہ ہیں، میں نے کسی کو انہیں ضعیف کہتے ہوئے نہیں سنا، حضرت علامہ کشمیری ابن معین کے اس قول سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ابن معین کے دور تک امام صاحب کے بارے میں جرح کا ثبوت نہیں تھا، ابن معین کی وفات ۲۳۳ھ میں ہے، بعد میں اگر کسی نے جرح کی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

تیسرے راوی موسیٰ بن ابی عائشہ کوئی ہیں، جو بالاتفاق ثقہ اور ثبت ہیں صحیحین کے رجال میں ہیں، چوتھے راوی عبد اللہ بن شداد ہیں جو روایت صحابی اور روایت تابعی ہیں، ان کا ثقہ ہونا یقینی چیز ہے، ایسا راوی مسند بھی روایت کرے تو اس کا قبول کرنا محدثین کے قول کے مطابق بھی ضروری ہے اور پانچواں نام عظیم المرتبت صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ تمام راوی ثقاہت کے اعلیٰ معیار کو پورا کرتے ہیں، تو روایت پر کلام کرنے کی گنجائش نہیں، اس لیے ابن ہمام نے اس روایت کو صحیح علی شرط الشیخین قرار دیا ہے، علامہ عینی نے بھی صحیح کہا ہے۔

امام دارقطنی کی تنقید

اس روایت کو دارقطنی نے بھی تنی سندوں سے نقل کیا ہے اور اس پر یہ تنقید کی ہے لسم بسنده عن موسى عن ابى عائشه غير ابى حنيفة والحسن بن عماره، وهما ضعيفان کہ اس روایت کو موسیٰ بن ابی عائشہ سے، ابو حنیفہ اور حسن بن عمارہ کے علاوہ کسی نے مسند بیان نہیں کیا ہے اور یہ دونوں (حفظ کے اعتبار سے) ضعیف راوی ہیں۔ لیکن دارقطنی کی دونوں باتیں غلط ہیں، نہ امام اعظم کو ضعیف قرار دینا صحیح ہے اور نہ یہ دعوے صحیح ہیں کہ امام صاحب اور حسن بن عمارہ کے علاوہ کسی نے اس کو مرثوفاً بیان نہیں کیا جہاں تب امام صاحب کو ضعیف کہنے کی بات ہے تو یہ ایسی مہمل بات ہے جس کا جواب

اور یہ مرسل تو ایسا ہے کہ توارث کے طور پر ایک بڑی جماعت کا عمل اس کی موافقت میں موجود ہے اور یہ کہ اس کی تائید اتنے طرق سے ہو رہی ہے کہ اس سے قوت بڑھ جاتی ہے۔ محدثین کے اصول میں یہ بھی ہے کہ اگر مرسل کسی دوسرے طریق سے موصولاً مروی ہو تو اس کی طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ قابل استدلال ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایت اول تو متعدد صحابہ سے منقول ہے اور ان تمام میں کم از کم حضرت جابرؓ کی روایت توحیح اور متصل سندوں کے ساتھ آ رہی ہے اور عبد اللہ بن شداد سے مرسل روایت کے صحیح الاسناد ہونے میں تو محدثین کا کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، باقی طرق حسن بھی ہیں اور ضعیف بھی، اس لیے ابن حجر کا تخریج احادیث الرافعی میں اس حدیث کی تمام سندوں کو معلول کہہ دینا صحیح نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نقل ہی کمزور سندیں کی ہیں اور ان پر کلہا معلولہ کا حکم لگا دیا، ورنہ تمام طرق پر معلول کا حکم لگانا بالکل خلاف واقعہ ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ من کان لہ الامام الخ صحیح روایت ہے، اور اس میں صراحت کے ساتھ یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ مقتدی کی نماز کو قرأت سے خالی سمجھنا غلط ہے، مقتدی کو امام کی قرأت کی بنیاد پر شرعاً قاری تسلیم کیا گیا ہے اور خود مقتدی کو قرأت سے روک دیا گیا ہے، پھر اس تصریح کے بعد حضرت عبادہؓ کی روایت میں لمن لم یقرء کے عموم میں مقتدی کو کیسے شامل کیا جاسکتا ہے؟

مقتدی کے قرأت کو ترک کر دینے کی روایت

اب اس موضوع پر تیسری روایت بھی پیش ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ قرأت خلف الامام پر اظہار ناراضگی کے بعد، تمام مقتدیوں نے اس عمل کو ترک کر دیا تھا، یہ روایت موطا امام مالک، نسائی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد وغیرہ میں موجود ہے، موطا مالک کے الفاظ یہ ہیں۔

مالک عن ابن شہاب عن ابن اکیمة اللیثی عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ انصرف من صلاة جهر فیہا بالقراءة فقال: هل قرأ معی منکم

سے واقف ہو، منصف ہو، خیر خواہ ہو، متعصب نہ ہو، خود پسندی کا مریض نہ ہو، فاضل نہ ہو، اعتدال بقول المتعصب کما قدح الدار قطنی فی الامام ابی خنیفة بانہ ضعیف فی الحدیث و ای شناعة فوق هذا؟ کہ متعصب کی بات کا کیا اعتبار؟ جیسے دار قطنی نے امام ابوحنیفہؒ کو ضعیف کہہ دیا، اس سے زیادہ بدتر کیا بات ہوگی؟ پھر کچھ آگے چل کر یہ فرمایا کہ والحق ان الاقوال التي صدرت عنہم کلہا صدرت من التعصب لا تستحق ان یلتفت الیہا، کہ امام اعظمؒ کی شان میں اس طرح کی تمام باتیں تعصب کا نتیجہ ہیں جو کہ کسی حال میں بھی لائق التفات نہیں ہیں۔

اسی طرح دار قطنی کا دوسرا اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کہ اس روایت کو صرف امام اعظمؒ اور حسن بن عمارہ نے مرفوعاً بیان کیا ہے، کیونکہ موسیٰ بن ابی عائشہ سے مرفوعاً بیان کرنے والوں میں سفیان اور شریک بھی ہیں، امام احمد بن حنبل (المتوفی ۲۴۱ھ) نے اپنی مسند میں یہ روایت ذکر کی ہے، احمد بن حنبل کا بر محدثین میں ہیں، صحاح ستہ کے تمام مصنفین ان کے تلامذہ میں ہیں، علم میں انھیں امام احمد بن حنبل کے ہم پایہ قرار دیا گیا ہے، ان کی کتاب مسند، محدثین کے درمیان متداول بھی رہی ہے، مسند احمد بن حنبل کی سند اس طرح ہے اخبرنا اسحاق الازرق حدثنا سفیان و شریک عن موسیٰ بن ابی عائشہ عن عبد اللہ بن شداد عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یہ سند بالکل صحیح ہے بصری نے اس کے بارے میں سندہ صحیح کہا ہے، اسحاق ازرق صحیح کے راوی ہیں، باقی تمام روایات بھی صحیح کے ہیں، سفیان اور شریک، دونوں اس روایت کو موسیٰ بن ابی عائشہ سے مرفوعاً بیان کرنے میں امام اعظمؒ کے ساتھ شریک ہو گئے، تنہا امام اعظمؒ کا طریق نہ رہا یہ نہ صحیح مرفوعاً نقل کرنے والوں میں اور بھی نام ہیں۔

افسوس ہے کہ اس کے باوجود حقیقت کو تسلیم کرنے کے بجائے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ روایت مسند نہیں ہے وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن شداد سے مرسل آ رہی ہے جیسا کہ مصنف بن ابی شیبہ وغیرہ میں ہے، لیکن انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جس طریق میں مرسل ہے اسے مرسل کہو اور جس طریق میں مرفوع ہے اس کو مرفوع تسلیم کرو۔ اور اگر بالفرض مرسل بھی ہے تو مرسل بھی تو حجت ہوتی ہے اور صحابی کا مرسل تو بالاتفاق حجت ہے

لاستعملوا الا بفتح الکتاب ارشاد فرمایا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے امام کے قرأت کو تو منع فرمایا تھا، لیکن سورۃ فاتحہ کی قرأت کی اباحت موجودہ کے طور پر اجازت دی تھی، لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کی مندرجہ بالا روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اباحت موجودہ بھی عارضی تھی جو برقرار نہیں رہی، کیونکہ اس روایت میں سورۃ فاتحہ کا بھی استثناء نہیں ہے اور ہر قرأت کو سبب منازعت قرار دے کر اظہار تارائضگی کیا گیا ہے اور اس کے نتیجہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اس کے بعد جہری نمازوں میں تمام مقتدیوں نے قرأت خلف الامام کو ترک کر دیا۔

اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں جہری نماز میں ترک قرأت کی صراحت ہے، سری کی نہیں ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کی آیت اذا قرأ القرآن الآیہ جہری اور سری دونوں کو عام ہے، اسی طرح حدیث اذا قرأ فانصتوا بھی مقتدی کو خاموشی اختیار کرنے کی نصیحت کر رہی ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت میں بھی جو علت بیان کی جا رہی ہے وہ منازعت اور تکلف ہے جس کا تحقق جہری نمازوں سے زیادہ سری نمازوں میں ہوتا ہے، اس لیے اس روایت سے درجہ اولیٰ میں سری نمازوں میں بھی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

اس روایت پر بھی طرح طرح کے اعتراضات کئے گئے ہیں، ایک اعتراض تو یہ ہے کہ ابن اکیمہ لیشی مجہول راوی ہیں اس لیے روایت استدلال کے قابل نہیں، لیکن یہ اعتراض بھی اصول حدیث کے مطابق درست نہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ ابن اکیمہ لیشی سے روایت کرنے والوں کی تعداد چار تک پہنچتی ہے جن میں ان کے پوتے عمر بن مسلم، امام زہری، سعید بن ابی ہلال اور ابو الجویرث عبدالرحمن بن معاذ یہ شامل ہیں اور جس شیخ سے چار تلامذہ روایت کریں اس پر جہالت کا شبہ خلاف اصول ہے، دوسرے یہ کہ موطا کی مسند روایات پر کلام کرنا بھی جرات ہیجا معلوم ہوتی ہے اور تیسری بات یہ کہ ابن اکیمہ کو ابو حاتم یحییٰ بن سعید اور ابن حبان وغیرہ نے ثقات میں شمار کیا ہے اور بھی متعدد ائمہ سے ان کے بارے میں توثیق کلمات منقول ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ فانتھی الناس عن القراءة مع رسول اللہ

احد انفا؟ فقال رجل نعم: انا يا رسول الله: قال فقال رسول الله ﷺ انی اقول: مالى انازع القرآن فانتھی الناس عن القراءة فيما جهر فيه رسول الله ﷺ حين سمعوا ذلك من رسول الله ﷺ (ص ۲۹)

”امام مالک، ابن شہاب زہری سے اور وہ ابن اکیمہ لیشی سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی نماز سے فارغ ہوئے جس میں آپ نے جہری قرأت کی تھی، پھر فرمایا کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی ہے، تو ایک شخص نے عرض کیا۔ جی ہاں! یا رسول اللہ! میں نے کی ہے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ مجھے یہ کیا ہوا کہ میرے ساتھ قرآن کی تلاوت میں تکلف کی جا رہی ہے۔ چنانچہ آپ کے اس ارشاد کو سننے کے بعد، لوگوں نے جہری نمازوں میں قرأت کو ترک کر دیا۔“

اس روایت سے پہلی نظر میں چند باتیں معلوم ہوتی ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ نمازوں میں قرأت خلف الامام کا رواج نہیں تھا، کیونکہ آپ کے نکیر فرمانے پر صرف ایک شخص نے اعتراف کیا ہے کہ حضور! یہ کام میں نے کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس ایک شخص کی قرأت بھی جہری نہیں سری ہے، کیونکہ آپ کا سوال هل قرا ہے، یعنی سوال یہ ہے کہ کیا کسی نے قرأت کی ہے؟ اگر اس شخص نے جہر کیا ہوتا تو سوال من قرا یا من جهر ہوتا، کہ قرأت کون کر رہا ہے؟ اور تیسری بات یہ ہے کہ آپ کے انکار کی بنیاد جہر نہیں، بلکہ تکلف اور منازعت ہے؟ جو جہری میں کم اور سری میں زیادہ ہونی چاہیے، کیونکہ جب جہری نماز میں قرأت میں مشغول ہوگا تو مقتدی کی قرأت کا امام پر اثر کم ہو سکتا ہے لیکن اگر نماز سری ہو تو مقتدی کی قرأت کا امام پر یقیناً زیادہ اثر ہوگا، غور کرنے کی بات ہے کہ جہری نماز میں ایک فرد کی سری قرأت کا یہ اثر ہوا کہ منازعت کی صورت پیدا ہو گئی اور آپ نے ناگواری کا بھی اظہار فرمایا، تو اگر سری نماز ہو اور مقتدیوں کی صف قرأت میں مشغول ہو تو پھر منازعت کتنی بڑھ جائے گی۔

اس تقابل سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ حضرت عبادہؓ کی تفصیلی روایت میں جو یہ آیا تھا کہ فجر کی نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی مقتدی کی قرأت سے گرانی ہوئی تو آپ نے

(۶) رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم حیات طیبہ میں ہمیشہ نمازوں کی امامت فرماتے رہے، مقتدی بن کر نماز پڑھنے کی نوبت شاذ و نادر پیش آئی، مگر عجیب بات ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری نماز باجماعت جو مرض الوفات کے درمیان پڑھی گئی، اس کی تفصیلات سے مقتدی پر فائقہ کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کا اختصار یہ ہے کہ مرض الوفات نے جب شدت اختیار کر لی تو مسجد نبوی میں حضرت ابو بکر صدیق کو نماز پڑھانے کا حکم دے دیا گیا، وہ برابر نماز پڑھاتے رہے، ایک دن ظہر کی نماز میں آپ نے مرض میں تخفیف محسوس فرمائی تو دو آدمیوں کے سہارے سے آپ مسجد میں تشریف لائے، نماز حسب معمول شروع ہو چکی تھی، غور فرمائیے کہ ابتداءً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ نماز میں شرکت کا نہیں تھا اور نہ اس کی کوئی امید تھی، ورنہ یقیناً انتظار کیا جاتا۔ بخاری ہی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں وجہ رسول اللہ ﷺ فی نفسه خفة فخرج فاذا ابو بکر يؤم الناس (ص ۹۳) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض میں تخفیف محسوس کی تو باہر آئے، دیکھا تو ابو بکر نماز میں امامت کر رہے ہیں۔ منشا عرض کرنے کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے کا ارادہ نماز شروع ہونے کے بعد فرمایا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگرچہ حجرہ مبارک بہت قریب ہے، لیکن بیماری کی وجہ سے آپ خود نہیں چل پارہے ہیں، دو آدمیوں کے سہارے سے آرہے ہیں، اور پیرا اٹھانا دشوار ہو رہا ہے روایت میں آتا ہے جلاہ تخطان الارض کہ پیروں سے زمیں پر خط کھینچ رہا تھا، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں حجرہ سے مسجد تک جانے میں اتنا وقت ضرور صرف ہو گیا ہوگا کہ حضرت ابو بکر سورۃ فاتحہ پڑھ چکے ہوں گے، اور ابن ماجہ وغیرہ کی صحیح روایت میں اس قرأت کی یہ تفصیل آ رہی ہے۔

واخذ رسول اللہ ﷺ من القراءۃ من حیث کان بلغ ابو بکر۔
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرأت وہاں سے شروع کی جہاں تک ابو بکر پہنچ چکے تھے۔

یہ روایت ابن ماجہ (ص ۸۷) مسند احمد، بیہقی اور طحاوی وغیرہ میں ہے۔ مسند احمد کی

صلی اللہ علیہ وسلم الخ نہ غیر علیہ السلام کا قول ہے اور نہ حضرت ابو ہریرہؓ کا یعنی یہ حدیث نہیں ہے بلکہ یہ تو امام زہری کا قول ہے اور دلیل یہ ہے کہ ابو داؤد وغیرہ میں اسی روایت کے بعض طرق میں قال الزہری فاتعظ الناس فلم یکنوا یقرؤن آیا ہے جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ امام زہری کا قول ہے۔

مگر یہ اعتراض بے سود معلوم ہوتا ہے، پہلی بات تو یہی ہے کہ یہ جملہ حضرت ابو ہریرہؓ کا ہے یہ ابو داؤد میں ابن ابی السرح کے حوالہ سے یہ بات حضرت ابو ہریرہؓ کی طرف منسوب کی گئی ہے قال معمر عن الزہری قال ابو ہریرۃ فانہی الناس اور یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ معمر کو اثبت الناس فی الزہری تسلیم کیا گیا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ جملہ امام زہری کا ہو تو اس سے مسئلہ پر فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ اصلی روایت تو مالی انازع القرآن پر ختم ہو گئی، اب آگے بیان کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے ارشاد کا صحابہ پر اثر کیا ہوا۔ یہ بات حضرت ابو ہریرہؓ فرمائیں تو اور امام زہری فرمائیں تو معنی ایک ہی ہیں کہ تمام صحابہ نے یہ عمل ترک کر دیا تھا، امام زہری کی طرف انتساب سے بھی اہمیت کم نہیں ہوتی کیونکہ زہری کی پیدائش ۵۸ھ کی ہے، وہ جلیل القدر تابعین میں ہیں، ان کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عمال کو لکھا تھا علیکم بابن شہاب فانکم لاتجدون احدا اعلم بالسنة الماضية منه۔ ابن شہاب کے دامن کو مضبوطی سے تھام لو کہ تمہیں ان سے زیادہ مستند ماضیہ کا جاننے والا کوئی نہیں ملے گا اور ابن شہاب جب سنت ماضیہ کے سب سے بڑے عالم ہیں تو ان کا صحابہ کے بارے میں یہ خبر دینا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد سب نے قرأت خلف الامام کا عمل ترک کر دیا تھا۔ نہایت مضبوط دلیل ہے۔

حدیث پاک کے ذخیرہ میں قرأت خلف الامام کی ممانعت کے لیے اور بھی بہت روایات ہیں مگر ہم انہی تین روایات پر اکتفا کر رہے ہیں اور اسی مختصر بحث سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت عبادہؓ کی روایت پر احادیث صحیحہ کی روشنی میں غور کیا جائے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ لمن لم یقرء کے عموم میں مقتدی کو شامل کرنا غلط ہے، اب اس کے بعد منصفانہ ہر کے لیے قائم کردہ بنیادوں کے نقطہ سادس پر مختصر گفتگو شروع کی جاتی ہے۔

شروع کیا تو ان کا سانس پھول گیا، اور وہ صف سے پہلے ہی رکوع میں چلے گئے، اور اسی حالت میں چل کر صف سے جا ملے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ سانس کس کا پھول رہا تھا تو ابو بکرؓ نے جواب دیا خشیت ان تسفلتني الركعة معك، مجھے یہ اندیشہ تھا کہ آپ کے ساتھ میری رکعت فوت نہ ہو جائے یعنی اس وجہ سے میں نے تیز گامی اختیار کی اور سانس پھول گیا۔

اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ حضرت ابو بکرؓ نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی اور رکوع میں شریک ہو گئے، اور دوسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جذبہ کی تعمین تو فرمائی کہ خدا تمہاری حرص عبادت میں اضافہ فرمائے، مگر یہ نہیں فرمایا کہ تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ صرف یہ فرمایا کہ آئندہ ایسا نہ کرنا کہ تیز چل کر آؤ، یا آئندہ ایسا نہ کرنا کہ صف سے پہلے ہی رکوع میں چلے جاؤ وغیرہ چنانچہ امام بخاری نے بھی حضرت ابو بکرؓ کی روایت (ص ۱۰۸) پر جو عنوان دیا ہے اس میں نماز کے صحیح نہ ہونے کی صراحت نہیں کی، عنوان ہے اذ رکع دون الصف، کہ نمازی صف سے پہلے ہی رکوع میں چلا جائے تو کیا حکم ہے؟ قرأت خلف الامام کے سلسلے میں بخاری کے ذوق کا تقاضہ تو یہی تھا کہ وہ اس صورت میں نماز کے صحیح نہ ہونے کی تصریح کریں، مگر دلیل نے ساتھ نہیں دیا اس لیے فیصلہ کن بات نہ کہہ سکے، اس ترجمہ الباب کے بارے میں گفتگو اپنے موقع پر آئے گی، یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ امام بخاری کے نزدیک بھی یہی ثابت معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کی اس نماز کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔

امام بخاری کی روایت پر مختصر گفتگو کے بعد اب اس سلسلے میں ابوداؤد کی روایت دیکھئے جس میں مد رک رکوع کو صراحت کے ساتھ رکعت کا مد رک قرار دیا گیا ہے۔

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا جئتم الى الصلاة ونحن مسجود فاسجدوا ولا تعدوا هاشينا ومن ادرك الركعة فقد ادرك الصلاة۔ (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۹)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم ایسی حالت میں نماز کے لیے آؤ کہ ہم سجدہ میں ہوں تو سجدہ میں چلے جاؤ اور اس کو بالکل شمار نہ کرو، اور جس نے رکوع کو پالیا تو بیشک اس نے نماز کو پالیا۔

ایک روایت کے الفاظ میں فقرا من المكان الذي بلغ ابو بكر من السورة (جلدا، ص ۲۰۹) ہے، سورت سے مراد اگر سورۃ فاتحہ کے علاوہ ہے تو گویا فاتحہ کی قرأت کے بعد دوسری سورۃ شروع ہو چکی تھی اور اگر سورت سے مراد فاتحہ ہی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورۃ فاتحہ کے ایک حصہ کی قرأت ہو چکی تھی۔ بہر حال اس نماز میں جو بظاہر مقتدی بن کر شروع ہوئی تھی اور فوراً ہی استخلاف کی صورت پیش آ گئی، اور آپ امام بن گئے، اس نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ فاتحہ کی قرأت درمیان سے شروع کی یا سورۃ فاتحہ کے بعد کسی اور سورۃ کو درمیان سے پڑھا، اس سے یہ ثابت ہوا کہ امام کی قرأت مقتدی کے لیے کافی ہے اور مقتدی پر بذات خود فاتحہ کی قرأت واجب نہیں ہے۔

مد رک رکوع سے استدلال

پھر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ آخری عمل، بالکل وہی ہے جس کی آپ پہلے تعلیم بھی دے چکے ہیں کہ اگر مقتدی نے امام کے قرأت سے فارغ ہونے کے بعد نماز میں شرکت کی اور امام کے ساتھ رکوع کی حالت میں شریک ہو گیا تو اس کی یہ رکعت صحیح اور مکمل ہے، ایسا نہیں ہے کہ فاتحہ کے ترک کی بنیاد پر اس رکعت کو شمار نہ کیا جائے، اس کے ثبوت کے لیے متعدد احادیث ہیں، ہم بخاری، ابوداؤد اور ابن خزیمہ کی ایک ایک روایت ذکر کر رہے ہیں۔ بخاری کی روایت یہ ہے۔

عن ابی بکرۃ انه انتهى الى النبي ﷺ وهو راكع فركع قبل ان يصل الى الصف فذكر ذلك للنبي صلى الله عليه وسلم فقال زادك الله حرصا ولا تعد۔ (بخاری جلد ۱ ص ۱۰۸)

حضرت ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ایسی حالت میں پہنچے کہ آپ رکوع میں جا چکے تھے تو ابو بکرؓ نمازیوں کی صف تک پہنچنے سے پہلے ہی رکوع میں چلے گئے اس بات کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا، خدا تمہاری اس حرص میں اضافہ کرے، اور آئندہ ایسا نہ کرنا۔

یہ الفاظ تو بخاری کی روایت کے ہیں، دوسری کتابوں میں حضرت ابو بکرؓ کی نماز میں شرکت کی جو حدیث ہے، اس میں وہ یہ ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے رکوع میں شرکت کے لیے تیز چلنا

صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت اور زیادہ صریح ہے اور ابن خزیمہ نے اس پر عنوان قائم کیا ہے باب ذکر الوقت الذی یکون فیہ الماموم مدرکاً للسرکعة اذا رکع امامہ قبل کہ اگر امام رکوع میں چلا جائے تو مقتدی کو کس وقت تک مدرک رکعت مانا جائے گا۔

عن ابی ہریرۃ مرفوعاً من ادرك رکعة من الصلاة فقد ادركها قبل ان یقیم الامام صلیہ (صحیح ابن خزیمہ جلد ۳، ص ۲۵)

حضرت ابو ہریرہؓ مرفوعاً نقل کرتے ہیں کہ جس شخص نے امام کے سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے نماز میں رکوع کو پایا تو اس نے نماز کو پایا۔

یہ دونوں روایتیں، مقتدی کے رکوع میں امام کو پالینے کی صورت میں نماز کی تمامیت کو بتاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں مقتدی فاتحہ کی قرأت نہیں کر سکتا، اس لیے اب ان روایات پر کلام شروع ہو گیا، امام بخاری نے جزء القراءۃ میں کچھ راویوں پر جرح کر دی، قاضی شوکانی نے کہا کہ من ادرك السرکعة میں رکعت سے مراد رکوع نہیں، پوری رکعت ہے وغیرہ۔

لیکن ہمارا استدلال اس بنیاد پر ہے کہ ابوداؤد نے اپنی کتاب میں روایت ذکر فرمائی ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ روایت میں زیادہ کمزوری ہوتی ہے تو وہ سکوت نہیں کرتے، روایت ذکر کر کے سکوت اختیار کرنا ابوداؤد کے اصول کے مطابق روایت کے قابل استدلال ہونے کی دلیل ہے نیز یہ کہ امام منذری نے بھی سکوت اختیار کیا ہے، اور یہ کہ یہ روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ذہبی نے حاکم کی تصحیح کو برقرار رکھا ہے۔ یہ باتیں روایت کے قابل قبول ہونے کے لیے کافی ہیں اور امام بخاری کی جرح کا جواب بھی دیا جاسکتا ہے مگر تفصیل کا موقع نہیں۔

اسی طرح قاضی شوکانی کا اعتراض بھی انصاف سے بہت دور ہے، حدیث پاک میں دسیوں جگہ السرکعة رکوع کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، خصوصاً اگر کسی روایت میں لفظ سجدہ کے ساتھ رکعت کا لفظ استعمال کیا جائے تو وہاں رکوع کے معنی متعین ہو جاتے ہیں، نیز یہ کہ قاضی شوکانی پہلے تو اس کے قائل تھے کہ مدرک رکوع، مدرک صلوة نہیں ہے اور اس کو یہ رکعت قضا کرنا ہوگی لیکن انھوں نے ”الفتح الربانی“ میں جو ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، اس

قول سے رجوع کر لیا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ مدرک رکوع کے مدرک رکعت قرار دیے جانے پر روایات صراحت سے دلالت کر رہی ہیں، اسی لیے جمہور یعنی امام اعظم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ثوری، امام اوزاعی اور ابو ثور وغیرہ کا مسلک یہی ہے کہ مدرک رکوع کی رکعت شمار ہوگی، صحابہ کرام میں حضرت علیؓ حضرت ابن مسعودؓ حضرت زید اور حضرت ابن عمرؓ سے بھی یہی منقول ہے۔ منصفانہ جائزے کے بنیادوں کے نقطہ سادس پر کی گئی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری عمل اور مدرک رکوع کے بارے میں آنے والی روایات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مقتدی پر فاتحہ کی قرأت واجب نہیں تو حضرت عبادہؓ کی روایت میں لمن لم یقرء کے عموم میں مقتدی کو کیسے شامل کیا جاسکتا ہے؟ اب اس کے بعد نقطہ سابع پر مختصر گفتگو کا آغاز کیا جاتا ہے۔

(۷) صحابہ کرام کے آثار

اختلافی مسائل میں صحیح فیصلہ تک پہنچنے کا ایک آسان اور معتبر طریقہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کے آثار اور ان کے اقوال و اعمال کو دیکھا جائے کیونکہ امت محمدیہ کی یہ مقدس جماعت، پیغمبر علیہ السلام کی اولین مخاطب اور آپ کے خشاء کو صحیح طور پر سمجھنے والی ہے اور آپ نے امت کو ان کی پیروی کا حکم دیا ہے۔

جمہور صحابہ سے کثرت کے ساتھ ترک قرأت خلف الامام کے آثار صحیح اور حسن سندوں کے ساتھ منقول ہیں، علامہ یعنی نے عمدۃ القاری میں لکھا ہے کہ اشی صحابہ کرام سے ترک قرأت خلف الامام ثابت ہے، امام شعبیؒ کا مقولہ صاحب روح النعانی نے نقل کیا ہے۔ ادركت سبعین بدویاً کلہم یمنعون المقتدی عن القراءۃ خلف الامام، میں نے غزوہ بدر میں شرکت کرنے والے ستر صحابہ کو پایا ہے اور وہ سب قرأت خلف الامام سے منع فرماتے تھے۔ امام محمد نے موطا میں لکھا ہے لا قرأۃ خلف الامام فیما جہربہ و فیما لم یجہر بذلک جاءت عامة الآثار، امام کے پیچھے جبری یا سری کسی نماز میں قرأت نہیں ہے اور صحابہ کرام اور تابعین کے آثار سے عموماً یہی ثابت ہوتا ہے یہاں ان آثار میں سے نمونہ کے طور پر چند کو پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

منقول ہے۔

مالک عن نافع ان عبد الله بن عمر كان اذا سئل هل يقرأ احد خلف الامام؟ قال اذا صلى احدكم خلف الامام فحسبه قراءة الامام واذا صلى وحده فليقرأ وكان عبد الله بن عمر لا يقرأ خلف الامام (موطا امام مالک ص ۲۹)

امام مالک، بواسطہ نافع حضرت عبد اللہ بن عمر سے نقل کرتے ہیں کہ ابن عمر سے جب یہ پوچھا جاتا کہ کیا کسی کو امام کے پیچھے قرأت کرنی چاہیے؟ فرماتے کہ جب تم میں سے کوئی امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کو امام کی قرأت کافی ہے اور جب تنہا نماز پڑھے تو قرأت کرے، اور خود عبد اللہ بن عمر امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے۔

اصح الاسانید سے آنے والے اس اثر کے مقابل یہ سند حسن کچھ ایسے آثار پیش کئے جاتے ہیں جن میں نماز میں قرأت کا ذکر ہے جیسے یہی نے نقل کیا ہے کہ ابو العالیہ نے نیکہ میں حضرت ابن عمر سے پوچھا اقرا فی الصلوة، نماز میں قرأت کروں؟ تو ابن عمر نے فرمایا۔ انی لاستحیی من رب هذه البنية ان اصلی صلوة لا اقرء فیها ولوبام القرآن، کہ مجھے خانہ کعبہ کے پروردگار سے حیا آتی ہے کہ میں ایسی نماز پڑھوں جس میں قرأت نہ ہو، اگرچہ وہ سورہ فاتحہ ہی ہو۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی سند، موطا امام مالک کی سند کے مقابل پیش نہیں کی جاسکتی، دوسرے یہ کہ اس اثر میں خلف الامام قرأت کا ذکر نہیں ہے، پھر اس کو مقابلہ میں پیش کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے، حضرت عبد اللہ بن عمر کے اثر میں جہری اور سری کی بھی تفصیل نہیں، وہ تو امام کے پیچھے ہر حال میں حسبہ قراءۃ الامام فرما رہے ہیں۔

حضرت جابر بن عبد اللہ کا اثر

حضرت جابر بن عبد اللہ کے اثر سے اور زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ مضمون ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کو پڑھنے کے تاکید حکم سے مقتدی متشی ہے، یہ اثر موطا امام مالک، ترمذی اور طحاوی وغیرہ میں ہے اور ترمذی نے اس کو حدیث حسن صحیح بھی کہا ہے۔

مالک عن ابی نعیم وھب بن کیسان انه سمع جابر بن عبد الله يقول: من صلی رکعة لم یقرأ فیها بآم القرآن فلم یصل الاوراء الامام۔ (موطا امام مالک ص ۲۸)

حضرت زید بن ثابت کا اثر

سب سے پہلے حضرت زید بن ثابت کا اثر ملاحظہ کیجیے جو مسلم شریف میں ہے۔

عن عطاء بن یسار انه سأل زید بن ثابت عن القراءۃ مع الامام فقال لا قراءۃ مع الامام فی شئی۔ (مسلم شریف جلد ۱ ص ۲۱۵)

عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ انھوں نے زید بن ثابت سے قرأت خلف الامام کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ امام کے ساتھ کسی بھی نماز میں قرأت نہیں ہے۔

مسلم کی روایت ہے سند بالکل صحیح ہے، امام نووی کو بھی کہنا پڑا کہ یہ امام ابو حنیفہ کا مسئلہ ہے مگر اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ صحیح روایت میں لا صلوة لمن یقرأ بآم القرآن آ رہا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، حضرت زید وغیرہ کے قول پر مقدم ہے اور دوسرا جواب یہ کہ حضرت زید کا قول، جہری نماز میں مازاد علی الفاتحہ پر محمول ہے۔ (نووی ص ۲۱۵ باختصار)

مگر ان دونوں جوابات کی کمزوری ظاہر ہے، کیونکہ بحث ہی یہ ہے کہ لمن لم یقرأ کے ظاہری اور مجمل عموم کو صحابہ کرام کیا سمجھ رہے ہیں؟ اگر اس روایت میں مقتدی کی صراحت ہوتی تب تو یہ بات درست تھی کہ حضرت زید کا قول، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ٹکرا گیا، اس کو ترک کر دیا جائے، یہاں تو یہ صورت ہے کہ آپ جو لمن لم یقرأ کو عام سمجھ رہے ہیں، صحابہ کرام کے آثار سے اس کی تائید نہیں ہوتی، نیز یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اذا قرء فانصتوا بہ سنو صحیح ثابت ہے تو حضرت زید کا قول ٹکرا رہا ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہے۔

اسی طرح دوسرا جواب کہ اس قول کو "ما زاد" پر محمول کیا جائے، قطعاً قابل قبول نہیں، حضرت زید کے ارشاد میں اس کے لیے نہ صرف یہ کہ کوئی اشارہ نہیں، بلکہ لا قراءۃ مع الامام فی شئی کا یہ مطلب نکالنا انصاف سے دور ہے اور گویا خلاصی کی کوشش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کیا حضرت عطاء نے "ما زاد علی الفاتحہ" کے بارے میں سوال کیا تھا؟ کہ جواب کو اس پر محمول کیا جائے۔

حضرت ابن عمر کا اثر

اصح الاسانید سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اثر موطا امام مالک میں ان الفاظ میں

قرأت خلف الامام کی مذمت کے آثار

البتہ یہ بات واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرأت خلف الامام سے جہاں ممانعت کے آثار منقول ہیں وہیں کچھ اکابر صحابہ سے قرأت خلف الامام پر سخت نکیر اور مذمت پر مشتمل آثار بھی ثابت ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔
من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرة (دار فکری جلد ۱ ص ۱۶۶)
جس نے امام کے پیچھے قرأت کی، اس نے فطرت کی خلاف ورزی کی۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

ان عمر بن الخطاب قال ليت لي فم الذي يقرأ خلف الامام حجرا۔
(موطا امام محمد ص ۱۰۲)

حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا، جو شخص قرأت خلف الامام کا عمل کرتا ہے کاش اس کے منہ میں پتھر ڈال دیے جائیں۔
حضرت سعد بن ابی وقاص سے منقول ہے۔

وددت ان الذي يقرأ خلف الامام في حجرة۔ (موطا امام محمد ص ۱۰۲)
میری خواہش یہ ہے کہ جو قرأت خلف الامام کرتا ہے، اس کے منہ میں انکارے ہوں۔
ان حضرات کے علاوہ قرأت خلف الامام پر اسی طرح کی مذمت کے آثار حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض اکابر تابعین سے منقول ہیں، ان آثار کی چونکہ کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی اس لیے حضرات صحابہ کی زبان سے نکلے ہوئے یہ سخت کلمات سن کر قرأت خلف الامام کرنے والوں کو غصہ آتا ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں ملتی کہ آثار کا انکار کر دیا جائے۔ امام بخاری نے بھی ایسا ہی راستہ اختیار فرمایا ہے۔

امام بخاری کا تبصرہ اور اس کی حقیقت

امام بخاری نے بھی جزء القراءة خلف الامام میں یہی راستہ اختیار فرمایا ہے کہ پہلے اس طرح کے بعض آثار نقل فرمائے، پھر اس کا جواب اس طرح دیا۔
(۱) بعض راویوں پر جرح کر دی، گویا ان آثار کا ثبوت ہی مشکوک ہو گیا۔
(۲) پھر یہ فرمایا کہ اس طرح کا کلام اہل علم کا نہیں ہو سکتا اور اس کے متعدد وجوہ ہیں۔

امام مالک، ابو نعیم، وہب بن کیسان سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے جابر بن عبد اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے نماز کی کوئی رکعت پڑھی اور اس میں ام القرآن کو نہیں پڑھا تو اس نے نماز نہیں پڑھی، الایہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو۔

اس اثر سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ نماز میں سورۃ فاتحہ کی قرأت سے مقتدی مستثنیٰ ہے اور یہ کہ جن روایتوں میں سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کا تاکید حکم دیا گیا ہے جس سے فقہاء کرام نے اپنے اصول کے مطابق وجوب یا رکینیت کو ثابت کیا ہے، وہ سب غیر مقتدی یعنی امام و منفرد پر محمول ہیں جیسا کہ آپ پہلے امام احمد بن حنبل اور سفیان کے بارے میں جان چکے ہیں، هذا لمن يصلي وحده۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا اثر

حضرت عبداللہ بن مسعود سے حدیث کی مختلف کتابوں میں قرأت خلف الامام کی ممانعت پر آثار منقول ہیں، موطا امام محمد کے الفاظ یہ ہیں۔

قال محمد اخبرنا سفیان الثوری حدثنا منصور عن ابی وائل عن عبداللہ بن مسعود قال انصت للقراءة فان في الصلوة شعلا و ميكفكفك الامام۔ (موطا امام محمد ص ۱۰۰)

امام محمد نے کہا کہ ہم سے سفیان ثوری نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہم سے منصور نے بواسطہ حضرت ابو وائل، حضرت عبداللہ بن مسعود سے بیان کیا، انھوں نے فرمایا، امام کی قرأت کے وقت انصت اختیار کرو اس لیے کہ نماز میں خاص مشغولیت ہوتی ہے اور تمہارے لیے امام کافی ہے۔

سند بالکل صحیح ہے، اور ارشاد کا مطلب بھی بالکل صاف ہے کہ مقتدی کے لیے انصت واجب ہے اور امام کی قرأت اس کے لیے کافی ہے۔

اسی طرح کے آثار خلفا راشدین یعنی حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم سے اور حضرت ابن عباس وغیرہ سے منقول ہیں جن کو حدیث کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے، اسی طرح تابعین کرام سے بھی متعدد آثار نقل ہیں مگر ہم صرف صحابہ کرام سے چند آثار نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

منہ میں مٹی یا انگارے ہوتے تو اس کی وجہ سے وہ قرأت خلف الامام سے باز رہتا۔

پھر یہ کہ ان آثار میں آگ کی سزا بافضل کہاں دی جا رہی ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس فعل کی قباحت بیان کرنے کے لیے ایسی خواہش کا اظہار کیا جا رہا ہے، پھر کہنے والے کے تصور میں کیا ضروری ہے کہ اس کا مصداق صحابہ کرام ہوں؟ ابراہیم نخعی سے موطا امام محمد میں منقول ہے ان اول من قرء خلف الامام رجل انهم (ص ۱۰۰) قرأت خلف الامام کرنے والے پہلے شخص کو متہم قرار دیا گیا یعنی اس کو بدعت کی طرف منسوب کیا گیا، طحاوی میں ابن عباس سے منقول ہے، لو كان لى عليهم سبيل لقلعت السنتهم جلد ۱، ص ۱۲۱) قرأت خلف الامام کرنے والوں پر میرا بس چلے تو میں ان کی زبان کھینچ لوں یقینی بات ہے کہ اس طرح کے سخت کلمات کہنے والوں کے علم میں امام بخاری کی طرح یہ بات ہوتی کہ یہ عمل بعض صحابہ کرام بھی کر رہے ہیں تو وہ اتنی سخت بات نہ کہتے۔

علامہ ابن تیمیہ کا جواب

علامہ ابن تیمیہ نے امام بخاری کے اس تبصرے پر فتاویٰ میں کلام کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس طرح کے آثار، ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو امام کی قرأت کو سن رہے ہوں اور اس کے باوجود وہ اپنی قرأت جاری رکھے ہوئے ہوں، کہ یہ لوگ ان ہی حضرات کی طرح ہیں جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مآلہ القرآن، یا علمت ان بعضکم خالجنہا فرمایا ہے، اس لیے اگر کسی کی تحقیق یا اعتقاد یہ ہو کہ امام کی قرأت کو سننے کے وقت، مقتدی کا خود قرأت کرنا، اللہ اور اس کے رسول کی معصیت ہے اور ایسا کرنے والا امر خداوندی کا تارک اور نبی خداوندی کا مرتکب ہے تو اس کے بارے میں یہ کہنا جائز ہے کہ اس کے منہ میں کوئی ایسی تکلیف ہو جاتی جس سے وہ معصیت سے محفوظ ہو جاتا، کیونکہ بتلائے تکلیف ہونا، بتلائے معصیت ہونے سے اہون اور کمتر ہے، یہ بالکل اس طرح کی بات ہے جیسے کلمہ حرام زبان سے ادا کرنے والے کے بارے میں کہہ دیا جائے لو کنت اخر من لکان خیر الک، تم گوگئے ہوتے تو اس سے بہتر تھا۔

پھر کچھ بحث کرنے کے بعد ابن تیمیہ نے فرمایا کہ ان آثار میں لعنت یا تعذیب نہیں ہے، صرف اس کی خواہش کا اظہار ہے کہ یہ ایسی چیز میں مبتلا ہو جاتا جو اس کو معصیت کے

(الف) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے لا تلعنوا بلعنة الله ولا بالنار ولا تعذبوا بعذاب الله، ایک دوسرے کو اللہ کی رحمت سے دوری اور جہنم کی بددعائیں نہ دو، اور اللہ کے عذاب (آگ) کی کسی کو سزا نہ دو۔ اور ان سخت الفاظ میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں، اس لیے یہ اہل علم کے الفاظ نہیں ہو سکتے۔

(ب) دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ جرأت کون کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے منہ میں انگارے بھرنے کی (نحوذ باللہ) خواہش کرے۔

(ج) جب قرأت خلف الامام کی حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوگئی تو اب دوسروں کی بات میں کیا حجت ہے؟ (جزء الثماني ص ۱۲)

مگر امام بخاری رحمہ اللہ کے یہ تمام ارشادات محل نظر ہیں، جہاں تک راویوں پر جرح کی بات ہے تو حقیقت یہ ہے کہ جن راویوں پر جرح کی گئی ہے، انھیں راویوں کی بعض ائمہ سے توثیق بھی منقول ہے پھر یہ کہ یہ تمام آثار ایک سند سے نہیں آرہے ہیں بعض آثار کئی کئی سندوں سے ثابت ہیں، موطا امام محمد، مصنف عبدالرزاق اور طحاوی شریف جزء القسرة للبيهقي اور دوسری کتابوں میں ان کی سندوں کو دیکھا جاسکتا ہے، انصاف پیش نظر ہو تو محدثین کے اصول کے مطابق سرے سے انکار کر دینے کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ ان کی کوئی نہ کوئی اصل ہے۔

اسی طرح امام بخاری نے ان آثار کے اہل علم کا کلام نہ ہونے کی وجہ بیان کی ہیں، وہ بھی ناقابل فہم ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ امام بخاری یہ فرض کر کے بحث کر رہے ہیں کہ قرأت خلف الامام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ کسی کے انکار کر دینے سے کیا ہوتا ہے؟ حالانکہ جمہور کے نزدیک صورت حال یہ ہے کہ قرأت خلف الامام کے ثبوت کے لیے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صراحت کے ساتھ کچھ منقول نہیں، اور ممانعت پر احادیث صحیحہ میں بہت کچھ منقول ہے اور اسی ممانعت کی تائید میں یہ آثار موجود ہیں۔

اس لیے اگر قرأت خلف الامام پر تکلیف کرتے ہوئے کسی کی زبان سے سخت الفاظ نکلے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس حکم خداوندی اور حکم رسالت کی خلاف ورزی نہ کرتا تو بہتر تھا، خواہ اس خلاف ورزی سے بچنے میں اس کو کچھ دنیاوی تکلیف برداشت کرنا پڑتی مثلاً

لقد اعجبني ان تكون صلوة المسلمين واحدة (ابوداؤد ص ۷۴)

مجھے یہ بات بہت پسند آئی کہ مسلمانوں کی نماز (باجماعت) صلوة واحدہ ہو۔

اور اس صلوة واحدہ میں احکام شرعیہ کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے کہ امام صفت صلوة میں اصل، متبوع اور موصوف بالذات ہے اور مقتدی اس کا تابع اور موصوف بالعرض ہے، جیسے کشتی اور اس میں سوار ہونے والے افراد میں سیر و حرکت کی صفت مشترک ہے، مگر سیر اور حرکت سے کشتی موصوف بالذات ہے اور اس میں بیٹھنے والے موصوف بالعرض ہیں۔

چند احکام شرعیہ سے نظر یہ کی وضاحت

احکام شرعیہ پر غور کرنے سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ نماز باجماعت میں امام کو اصل قرار دیا گیا ہے، اور مقتدی کو تابع کیا گیا ہے۔ مثلاً:

(۱) احادیث میں تصریح ہے کہ امام کو امتیازی اوصاف کا حامل ہونا چاہیے کہ وہ اعلم ہو اقرا ہو وغیرہ، اس میں امام کے اصل اور موصوف بالذات ہونے کا واضح اشارہ ہے۔

(۲) احادیث میں صراحت ہے کہ مقتدیوں کو ارکان کی ادائیگی میں امام سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں لاتباسدرو الامام الحدیث یا ان الامام یرکع قبلکم و یرفع قبلکم، امام سے آگے مت بڑھو اور یہ کہ امام تم سے پہلے رکوع میں جائے گا اور تم سے پہلے اٹھے گا، یہ احکام اسی لیے ہیں کہ امام متبوع ہے، موصوف بالذات ہے، اور مقتدی تابع اور موصوف بالعرض ہیں۔

(۳) امام کو کوئی عذر مانع صلوة پیش آ جائے تو فوراً استخلاف کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مقتدیوں کی نماز کو محفوظ رکھا جائے، اسی ضرورت کے سبب اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ صف اول میں اولو الاحلام والنہی کو رہنا چاہیے وغیرہ، جبکہ کسی مقتدی کو عذر پیش آنے کی صورت میں ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔

(۴) امام کی نماز صحیح ہے تو شرائط پوری کرنے والے تمام مقتدیوں کی نماز صحیح ہے، اور امام کی نماز میں فساد آ جائے تو تمام نمازیوں کی نماز فاسد ہو جاتی ہے، اگر امام موصوف بالذات نہ ہوتا اور تمام مقتدیوں کو موصوف بالذات قرار دیا گیا ہوتا تو امام کی نماز کا فساد مقتدیوں کو

ارتکاب سے روک دیتی اور ظاہر ہے کہ عملاً سزا دینے، اور سزا کی خواہش کا اظہار کرنے میں بہت فرق ہے، نیز یہ کہ حضرت علیؓ اور حضرت صدیق اکبرؓ نے بعض مرتدین کو آگ میں جلانے کی سزا بھی دی ہے، ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ اقدام تعذیب بالنار سے ممانعت والی روایات کی تاویل کے بعد کیا ہوگا، پھر جب تاویل کے بعد اقدام کرنا بھی جائز ہے تو گناہ میں مبتلا اور معصیت کے مرتکب کے بارے میں تعذیب بالنار کی خواہش پر مشتمل الفاظ استعمال کرنا بدرجہ اولیٰ ممنوع نہ ہونا چاہیے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۲۳ ص ۳۰۶)

امام بخاری کے تبصرے کا حاصل تو یہ تھا کہ ان آثار کا انکار کر دیا جائے اور ابن تیمیہ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ انکار کے لیے امام بخاری کے ذکر کردہ دلائل ناکافی ہیں اور قرأت خلف الامام کے سلسلے میں اس طرح کے سخت کلمات کے ذریعہ اظہار ناپسندیدگی مستبعد بات نہیں ہے اور جب ان آثار کی سند بھی قابل قبول ہے تو استبعاد یا انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

منصفانہ جائزے کے لیے قائم کردہ اس بنیاد پر بحث کرنے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کے آثار و اقوال سے مقتدی پر فاتحہ کے وجوب کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ صحیح اور اصح الاسانید سے آنے والے آثار سے صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقتدی کا فاتحہ پڑھنا یا کسی طرح قرأت کرنا جائز ہی نہیں ہے۔

اس موضوع سے فراغت کے بعد، اب منصفانہ جائزے کی آخری اور آٹھویں بنیاد۔ امامت و اقتداء کے بارے میں شریعت کی عام ہدایات پر اختصار کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے۔

امامت و اقتداء کے بارے میں شیخ الہند کا ارشاد

اس موضوع پر حضرت شیخ الہند قدس سرہ، بڑی مدلل اور فکر انگیز بحث فرماتے تھے، اختصار کے ساتھ سبق میں بھی بیان فرماتے اور اس کی تفصیل ان کی کتاب ایضاح الادلہ میں موجود ہے، ان کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ شریعت کی نظر میں امامت کا موضوع الگ، اور اقتداء کا موضوع الگ ہے، اور امام و مقتدی کے بارے میں شریعت کی عام ہدایات اور احکام شرعیہ پر نظر کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح سامنے آ جاتی ہے کہ مقتدی کو قرأت کا حق نہیں ہونا چاہیے کیونکہ شریعت نے جماعت کی نماز کو مصلین کے تعدد کے باوجود متعدد نہیں مانا ہے، بلکہ اس کو صلوة واحدہ کا حکم دیا گیا ہے، آپ کا ارشاد ہے۔

نماز باجماعت کی اس نظریہ کے مطابق تشریح

نماز کا معاملہ یہ ہے کہ اگر انسان منفرد ہو کر اس کو ادا کرتا ہے تو وہ خود نماز کے تمام ارکان کا ذمہ دار ہوتا ہے کیونکہ اس کا کسی سے کوئی ربط نہیں، لیکن اگر وہ منفرد نہیں ہے بلکہ اس نے کسی کو امام بنا کر اس کی اقتدا کو قبول کر لیا ہے تو کیا اس کی معیت کا صرف یہ فائدہ ہے کہ عمل کی جگہ ایک ہوگئی اور امام کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ وہ اٹھنے اور بیٹھنے کا اشارہ دیا کرے اور بس، اور اگر امام کی حیثیت صرف اتنی ہی ہے تو پھر ان اوصاف کی کیا ضرورت ہے جن کی احادیث میں صراحت کی گئی ہے کہ امام کو اقرء لکتاب اللہ پھر اعلم بالسنة، پھر اقدمهم ہجرۃ وغیرہ ہونا چاہیے۔

ان قیود کا مطلب تو یہی ہے کہ امام کی حیثیت اصل اور متبوع کی ہے، حکومتوں کا دستور بھی یہی ہے کہ وہ کسی شخص کو سفیر اور نمائندہ کی حیثیت سے نامزد کرتے ہیں تو کسی ہوش مند اور باوجاہت شخص کا انتخاب کرتے ہیں، یہاں بارگاہِ خداوندی میں نمائندہ کو منتخب کرنے کی بات ہے تو اس کے لیے علم و عمل کے اعتبار سے پاکیزہ اوصاف کے حامل انسان کی ضرورت ہے جو اپنی اور دوسروں کی ذمہ داری کو خوبی کے ساتھ ادا کر سکے، اسی لیے الامام ضامن فرمایا گیا ہے وغیرہ۔

پھر جب نمائندہ کا انتخاب ہو گیا تو اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کو کس سلسلے میں نمائندگی دی گئی، جہاں تک آدابِ عہدیت یعنی قیام، رکوع، سجدہ اور قومہ کا تعلق ہے تو یہ سب چیزیں تو مقتدی خود بھی کر رہا ہے اور کرنا بھی چاہیے کہ کسی کے دربار میں حاضری کے وقت آداب کی بجا آوری میں نمائندگی نہیں ہوتی، آداب تمام حاضرین کو خود بجالانے ہوتے ہیں، اگرچہ ان آداب میں بھی تقدم نمائندہ کو دیا جاتا ہے کہ وہ پہل کرتا رہے اور بقیہ حاضرین اس کے پیچھے چلتے رہیں البتہ ترجمانی کا حق کسی ہوشمند اور ذی وجاہت انسان کو دیا جاتا ہے اور حاضرین عرض حال میں خاموش رہتے ہیں۔

نماز کا جو طریقہ بتایا گیا ہے اس میں یہ ہے کہ پہلے دربارِ خداوندی میں حاضری کے لیے اعلان کیا جائے گا جس کی صورت اذان تجویز کی گئی ہے، پھر دربار میں حاضری کی شرائط بتا دی گئی ہیں کہ پاکی حاصل کرو، لباس پہنو وغیرہ، پھر نماز میں داخلہ کا ادب بتایا گیا ہے کہ

(۵) احادیث میں تصریح ہے کہ امام کا سترہ، تمام مقتدیوں کے لیے کافی ہے، اور مقتدی کا سترہ امام کے لیے کافی نہیں۔

(۶) حکم شرعی یہ ہے کہ امام کو سہو ہو جائے تو سجدہ سہو میں تمام نمازیوں کو شرکت کا حکم ہے، یہ نہیں کیا جاسکتا کہ سہو تو امام کو ہوا ہے ہم سے کیا تعلق؟ یا اس کے برعکس صورت ہو کہ مقتدی کو سہو ہو جائے تو اس پر سجدہ سہو نہیں آتا، یہ واضح دلیل ہے کہ امام اصل اور موصوف بالذات ہے، مقتدی کو اس کا تابع بنایا گیا ہے۔

(۷) سجدہ تلاوت میں بھی مقتدی کو امام کا تابع بنایا گیا ہے، فرض کیجیے کہ سری قرأت میں امام نے آیت سجدہ کی تلاوت کی، مقتدی نے سنا بھی نہیں، لیکن مقتدی کو امام کے ساتھ سجدہ تلاوت کا پابند بنایا گیا ہے۔

(۸) احادیث میں ہدایت کی گئی ہے کہ مقتدی دو یا دو سے زیادہ ہوں تو امام کو آگے کھڑا ہونا چاہیے اذا كنا ثلثة ان يتقدمنا احدنا، یہ حکم بھی امام کے اصل اور موصوف بالذات ہونے کی وجہ سے ہے۔

(۹) مقتدیوں کا اجتماعی طور پر ضم سورت سے سبکدوش ہونا، مقتدی کے تابع اور موصوف بالعرض ہونے ہی کی وجہ سے ہے۔

(۱۰) مقتدی کے امام سے قبل اٹھنے وغیرہ کے بارے میں احادیث میں ممانعت کی گئی ہے۔ الذی یرفع راسه و ینخفضه قبل الامام فانما ناصيته بيد الشيطان جو امام سے پہلے سر اٹھائے یا جھکائے تو اس کی پیشانی شیطان ہی کے ہاتھ میں ہے، صاف ارشاد ہے کہ مقتدی تابع اور موصوف بالعرض ہے۔

ان ہی چند احکام پر انحصار نہیں، بلکہ امامت و اقتداء کے تمام احکام میں یہ بات قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے کہ امام کی حیثیت، مقتدا، پیشوا، متبوع اور موصوف بالذات کی ہے اور مقتدی کو ہر اعتبار سے اس کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور شریعت نے جماعت کی نماز کو صلوة واحدہ قرار دے کر نمائندگی کا حق صرف امام کو دیا ہے اور آداب کی بجا آوری میں مقتدی کو امام سے پیچھے رہنے کی ہدایت دی ہے۔

نورانیہ کیفیت طاری ہوتی ہے کہ تمام بندے امام کے نور بعد خدا کے سامنے سر بسجود ہو جاتے ہیں، پھر سجدے سے سر اٹھاتے ہیں، تحیات بجالاتے ہیں، درود و سلام پڑھتے ہیں اور تعلیمات کرتے ہوئے کامیاب واپس ہو جاتے ہیں۔

نماز کی اس تشریح کی بنیاد یہی احادیث ہیں کہ مثلاً حضرت عبادہ کی روایت میں لا صلوة لمن لم یقرء بها فرمایا گیا ہے تو جماعت کی نماز میں جو شخص اصل اور موصوف بالذات ہے اس کو قرأت فاتحہ کا ذمہ دار بنایا گیا اور حضرت جابر کی روایت، من کان له امام فقرأه الامام فراءة له کے تقاضے میں جو لوگ تابع اور موصوف بالعرض تھے ان کو عمل قرأت سے روک دیا گیا اور اس کی پوری تفصیلات انما جعل الامام لیوتم به الحدیث میں آگئیں، جس میں صاف طور سے ہدایت کر دی گئی کہ آداب کی بجا آوری میں سب امام کی پیروی کریں اور مناجات کے عمل میں اذا قرء فانصتوا کے مطابق امام قرأت کرے اور مقتدی خاموش رہیں، اس طرح تمام روایات میں کوئی تعارض بھی نہیں رہتا۔ والعلم عند اللہ۔

منصفانہ جائزے کی اس بنیاد کے مرکزی مضامین حضرت شیخ الہند کی تقریر سے لیے گئے ہیں اور ان سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت عبادہ کی روایت میں لمن لم یقرء کے عموم میں مقتدی کو شامل کرنا درست نہیں ہے۔

خلاصہ مباحث

اس موضوع کی تفصیلات تو بہت ہیں اور سبق میں ان کا احاطہ ممکن نہیں لیکن الحمد للہ امام بخاری کے ترجمۃ الباب اور استدلال کے بارے میں جو باتیں عرض کرنی تھیں وہ پوری ہو گئیں، اور ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ امام بخاری کا ترجمۃ الباب کئی مسائل پر مشتمل تھا، جس میں سب سے اہم مسئلہ قرأت فاتحہ خلف الامام کا تھا، اور ترجمہ کے ذیل میں امام بخاری نے تین روایات پیش کی تھیں جن میں سے دو روایات کا تعلق امام و منفرد سے تھا اور صرف حضرت عبادہ کی روایت کے بارے میں گمان ہو سکتا تھا کہ اس کے عموم میں مقتدی بھی شامل ہے، پہلے تینوں روایات کی تشریح کر دی گئی، پھر حضرت عبادہ کی روایت کے عموم میں مقتدی کے شامل ہونے کے مسئلہ کو صیح کرنے اور اس سلسلے میں صیح نتیجہ تک پہنچنے کے لیے بنیادی نکات متعین کئے گئے کہ روایت کے طرق کو دیکھا جن میں تفصیل و اختصار کا

ہماری کبریائی اور عظمت و جلال کا اقرار کرتے ہوئے شریک ہو جاؤ، ہماری حمد و ثنا کرو، اب الحمد و ثنا کے بعد عرض و معروض اور مناجات کا وقت آیا جو تمام نماز میں اصل مقصود ہے اور جس پر حدیث میں الصلوۃ کا اطلاق کیا گیا ہے اس مناجات یعنی قرأت کی ذمہ داری امام کو تفویض کی گئی ہے اور جب یہ ذمہ داری امام کے سپرد ہو گئی اور اس نے تمام مقتدیوں کی جانب سے یہ بار اٹھالیا تو اب اگر مقتدی بھی قرأت کریں تو ایک طرف تو یہ آداب کی خلاف ورزی ہوگی اور دوسری طرف یہ کہ امام جو اصل اور متبوع ہے اس کی قرأت اکبری ہوگی اور مقتدی جو تابع ہے اس کی قرأت دوہری ہو جائے گی اس لیے مقتدی کو اس سے روک دیا گیا اور فرما دیا گیا۔ یکفیک الامام تمہارے لیے امام کافی ہے۔

اس مناجات کی تفصیل یہ ہے کہ امام تمام مقتدیوں کی جانب سے حمد و خداوندی شروع کرتا ہے جس میں سب کی طرف سے اھدنا الصراط المستقیم کی درخواست ہے، جب امام مناجات کا ایک اہم حصہ ادا کر لیتا ہے تو سب کی طرف سے آمین کہلا کر اس کی تصدیق کرائی جاتی ہے کہ اے پروردگار ہم سب کا مقصد ایک ہی ہے، پھر خدا کی طرف سے لعبدی ماسال کا انعام دیا جاتا ہے کہ بندوں کی درخواست مقبول ہے، پھر اھدنا الصراط المستقیم کے جواب میں جو کتاب ہدایت۔ ذلک الكتاب لاریب فیہ ہدی المتقین۔ کی شان کے ساتھ نازل کی گئی ہے اس کے کسی حصے کے ذریعے سے مناجات شروع ہو جاتی ہے، مناجات کا فریضہ سب کی طرف سے امام ادا کرتا ہے اور اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جماعت میں ہر طرح کے انسان ہوتے ہیں، ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کی درخواست کو رو نہیں کیا جاتا اور بعض کمزور بھی ہوتے ہیں لیکن وہ بھی ایسے لوگوں کے ساتھ شریک ہو کر قبولیت اور تقرب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

جب مناجات ختم ہو گئی اور قبولیت سے نواز دیا گیا تو اب پھر آداب کی تلقین کی گئی کہ تعظیم بجالاتے ہوئے ہماری بارگاہ میں جھک جاؤ، چنانچہ امام پیشوائی کرتے ہوئے رکوع میں چلا جاتا ہے تو سب رکوع میں چلے جاتے ہیں، رکوع سے اٹھتے وقت امام اطلاع دیتا ہے سمع اللہ لمن حمدہ، خدا نے حمد کرنے والوں کی حمد کو قبول کر لیا تو سب جواب دیتے ہیں ربنا لک الحمد اور جب بندے اس مختصر قیام میں بھی حمد کرتے ہیں تو مزید تقرب کے لیے اجازت ملتی ہے کہ سجدے میں چلے جاؤ، امام یہاں بھی پیشوائی کرتا ہے اور

فرق تھا، مختصر روایت میں بھی الفاظ میں کمی و بیشی کا فرق تھا۔ پھر اس روایت میں پائے جانے والے صریح مضامین، اور واضح قرائن کو دیکھا، قواعد عربیت کی روشنی میں صحیح مطلب تک پہنچنے کی کوشش کی، اس روایت کے راویوں کے مسلک کو دیکھا، ان تمام داخلی مضامین پر تادم قدر گفتگو کے بعد خارجی دلائل میں قرآن پاک احادیث، اور آثار صحابہ کی روشنی میں مسئلہ کو سمجھا اور آخر میں امامت و اقتداء کے بارے میں شریعت کی عام ہدایات اور احکام شریعہ کی رو سے غور کیا۔ اور ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ حضرت عبادہ کی روایت میں لمن لم یقرء کے عموم میں مقتدی شامل نہیں ہے اور یہ روایت صرف امام و منفرد سے متعلق ہے۔

لیکن ان تمام حقائق کے باوجود یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اگرچہ اس مسئلے میں اختلاف اولیٰ و غیر اولیٰ کا نہیں، واجب اور مکروہ تحریمی کا ہے لیکن اس مسئلہ میں قرن اول سے دورائے ہیں اس لیے تمام مسلمانوں کو اپنے ائمہ کے مسلک کے مطابق عمل کرنا چاہیے اور دوسرے فریق کے بارے میں تشدد اختیار نہیں کرنا چاہیے۔



تیر والی آرٹ پرنٹرز دہلی۔ فون: 2943292